2182 (1) Date Label!

(2) 3047 → f.

(3) 5417 — f.

(4) 63 ✓ N.A. Qadri 35

(5) 27 ✓ Dr. A... 3 — 3

(6) 706 ✓ 353 Koul

(7) 2007 ✓ f.

(8) 4679 247

(9) 1577 → 248

(10) 347 → 2...

1 60

(11) 4052

(12) 538

(13) 2216

(14) 2789

(15) 728 —

(16) 3101 R

(17) 2001 —

اُن مصیبت کے دِنوں کے نام ——————

جنہوں نے مجھے زبردستی مزاحیہ مضامین لکھنے پر مجبور کیا

فہرست

صرف ایک پیسے کی خاطر

اعظم شہر سے دور ایک نو آباد مہاجر بستی میں رہتا تھا جو شہر سے کوئی آٹھ میل دور واقع تھی۔ شہر سے اس مہاجر بستی تک موٹر بس کا کرایہ صرف ڈھائی آنے تھا یعنی صرف دس پیسے۔ دس پیسے بظاہر تو بڑی معمولی سی رقم ہے بالخصوص اعظم کے لئے جس کی تنخواہ ساڑھے تین سو روپے ماہوار ہے۔ لیکن دُنیا کے اس بازار میں بعض اوقات دس پیسے تو کیا صرف ایک پیسہ بھی قارون کے خزانہ سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

چنانچہ ایک دن کا واقعہ ہے۔ اعظم کچھ ضروری چیزیں خریدنے کے لئے شہر آیا اس کی جیب میں مبلغ چالیس روپے تھے ایک دوکان پر جب وہ پہنچا تو دوکاندار نے بڑا اصرار کیا کہ ولایتی چیزیں نہ خریدے بلکہ پاکستانی چیزیں خریدے۔ اور پاکستانی دستکاروں کی سرپرستی کر کے اپنی حب الوطنی کا ثبوت پیش کرے۔ اعظم دوکاندار کے اس جذبۂ حب الوطنی سے بڑا متاثر ہوا اور ولایتی چیزوں کے بجائے

پاکستانی چیزیں خریدیں تاکہ پاکستانی دستکاری کی حوصلہ افزائی ہو۔ دام ادا کرنے کے لئے جب اعظم نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اعظم کو بڑی خوشی ہوئی کہ کسی "ماہر فن پاکستانی دستکار" نے ایسی نفاست سے دستکاری انجام دی تھی کہ اعظم کو خبر بھی نہ ہوئی اعظم کو معاً پاکستان کا مستقبل بڑا تابناک نظر آنے لگا اور اُس نے خریدی ہوئی چیزیں دوکاندار کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ صاحب! میں پاکستانی دستکاروں کی ہنرمندی پر ابھی ابھی ایمان لے آیا۔ اس لئے اب ان چیزوں کو بطور ثبوت اپنے گھر لے جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بہرحال پاکستان میں دستکاری کا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔ آج ہمارے دستکار قینچی یا بلیڈ نہیں بنا سکتے تو کیا ہوا کم از کم قینچی یا بلیڈ چلانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں!"

دوکان سے باہر نکلنے کے بعد اعظم نے چالیس روپوں پر فاتحہ پڑھی اور اُوپر والی جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف نو پیسے نکلے۔ اعظم بڑا پریشان ہو گیا کہ اب گھر کیسے جائے۔ بس کا کرایہ دس پیسے ہے اس کی جیب میں صرف نو پیسے ہیں اور گھر آٹھ میل دُور ہے۔ یہاں شہر میں اس کا نہ کوئی دوست ہے اور نہ واقف! سارے دوست اور واقف کار اسی مہاجر بستی میں رہتے ہیں۔ جہاں وہ رہتا تھا۔ اعظم نے سوچا کچھ دیر سڑک پر آوارہ گردی کی جائے ممکن ہے کوئی دوست مل جائے یا کسی واقف کار سے مڈبھیڑ ہو اور وہ ایک پیسہ قرض حسنہ حاصل کرے لیکن پتہ نہیں اس کے دوستوں اور واقف کاروں کو کیا ہو گیا تھا۔ ایک کم بخت بھی شہر نہیں آیا تھا۔ یہ زن مرید

دوست کہیں کے! شام ہوتے ہی بیویوں کے پہلوؤں میں دبک جاتے ہیں۔

گھومتے پھرتے ایک جنرل اسٹور کے سامنے اسے اچانک سلمیٰ نظر آ گئی۔ سلمیٰ جو چند سال پہلے اعظم کی محبوبہ تھی لیکن چونکہ سلمیٰ ایک دولت مند گھرانے کی بیٹی تھی اور اعظم ایک فاقہ مست نوجوان اس لئے ان کی عاشقی قیدِ شریعت میں نہ آسکی تھی۔ اس کے باوجود دونوں میں من تو شدم تو من شدی کے باعث اتنی بے تکلفی تھی کہ دونوں کی حالت ایک دوسرے سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اس لئے اعظم نے سوچا۔ چلو۔ سلمیٰ ہی سے ایک پیسہ مانگ لیتے ہیں۔ سلمیٰ یہ سمجھے گی کہ اس کو ایک پیسے کی ضرورت نہیں بلکہ اس بہانے وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اور اس کے باوجود وہ اس کو پانچ سے دس روپے تک دے دیگی۔ اعظم تیز تیز ڈگ بھرتا سلمیٰ کی طرف بڑھا۔ اس وقت سلمیٰ فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہوئی اپنی کار میں بیٹھ چکی تھی۔ اور شاید ڈرائیور یا شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ اعظم نے کار کے قریب پہنچ کر کہا۔

"ہیلو مائی ڈیر سلمیٰ ۔ السلام علیکم ۔ سناؤ بھئی بہت دنوں بعد نظر آئی ہو؟"

سلمیٰ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً دوکان کی طرف دیکھا اور بولی :۔

"اعظم ——— خدا کے لئے اس وقت مجھ سے نہ ملو وہاں دوکان میں میرے خاوند کھڑے ہیں۔ وہ باہر آیا ہی چاہتے ہیں۔ جلدی چلے جاؤ، پھر کسی وقت ملیں گے پلیز!!"

اعظم نے کہا:۔

"فکر نہ کرو۔ میں تمہارے خاوند کے آنے سے پہلے ہی چلا جاؤں گا۔ اس وقت تم مجھے صرف ایک پیسہ بطور قرض حسنہ دے دو"

سلمیٰ نے اور زیادہ گھبرا کر دوکان کی طرف دیکھا اور بولی ۔

"اُف ـــ یہ مذاق کا وقت نہیں اعظم! میرے خاوند بڑے شکّی اور وہمی انسان ہیں ـــ دیکھو دیکھو ـ وہ آ رہے ہیں"

اعظم بھی گھبرا کر کار کے پاس سے ہٹ گیا اور دل ہی دل میں ایک مصرع ع بات بھی کھوئی التجا کر کے، پڑھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ جب سلمیٰ اور اس کے خاوند کی کار اس کے پاس سے گذر گئی تو اعظم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شکّی خاوند کی ڈرپوک بیگم سلمیٰ! تم نے یہ سمجھا کہ میں کوئی تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہنے والی حرکت کا مرتکب ہوا تھا۔ حالانکہ تم نہیں جانتیں کہ یہ مذاق بالکل نہیں تھا بلکہ سچ مچ ایک پیسے نے مجھے مجبور کر دیا ہے!"

اعظم پھر ایک پیسے کی تلاش میں سڑکوں پر گھومنے لگا۔ کوئی بے تکلّف دوست نہیں ملتا تھا۔ پتہ نہیں ضرورت کے وقت یہ بے تکلّف دوست کہاں کہاں جھک مارتے ہیں؟ دس بج چکے تھے اور اعظم تھک گیا تھا اور رات بڑھتی جا رہی تھی ایک بڑے شاندار ہوٹل کے سامنے اعظم کو کسی نے آواز دی۔ وہ اعظم کا ایک کار نشین دوست تھا اس لئے بے تکلّف بھی نہیں تھا۔ اس نے کار پارک کرنے کے بعد اعظم سے پوچھا۔

"آپ کہاں مٹر گشت کر رہے ہیں، آیئے ذرا یہاں بیٹھ کر کھانا کھا لیں"

اعظم کے جواب دینے سے قبل اس نے اعظم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور دونوں اس ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ اعظم انکار نہ کر سکا اور اس کے ساتھ کھانا کھانا پڑا، یوں بھی اسے شدّت کی بھوک لگی تھی۔ کھانا ختم ہونے کے بعد اُس دوست نے کوئی

چودہ روپے کا بِل دیا اور بیرے کو پونے دس آنے ٹپ دیا۔ یعنی ایک پیسہ کم دس آنے!
یعنی دس پیسے کے بس کے چار ٹکٹ! لیکن اعظم نے اس سے ایک پیسہ مانگنا یا اس
سے گھر تک لِفٹ دینے کی خواہش کا اظہار کرنا اپنی خودداری کے خلاف سمجھا۔ اگرچہ
بعض اوقات خودداری اور بے وقوفی میں صرف اُنیس بیس کا فرق رہ جاتا ہے۔

اعظم کا دوست اسے صدر بازار میں چھوڑ کر گھر چلا گیا۔ اس وقت گیارہ
بج رہے تھے اور بس اسٹاپ پر اس مہاجر بستی کو جانے والی آخری بس
تیار کھڑی تھی۔ اعظم نے سوچا۔ بس میں بیٹھ جانا چاہیئے۔ ہر روز صبح و شام
پورا کرایہ دے کر بس میں سفر کرتا ہوں، آج اگر ایک پیسہ کم ہو تو بس کنڈکٹر
کیا اعتراض کرے گا۔ اور کبھی کبھی تو یہ بھی ہوا ہے کہ بس کی بھیڑ اور اعظم کی مخصوص
خود فراموشی کے باعث ٹکٹ خریدنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ممکن ہے آج بھی
ایسا ہو جائے اور یہ نو پیسے بچ ہی جائیں۔

اعظم بس میں سوار ہو گیا۔ اس وقت بس کنڈکٹر اور ایک مسافر میں پہلے تکرار
اور پھر گالی گلوچ اور پھر اس کے بعد آپا دھاپی ہوئی۔ یعنی بسم اللہ ہی غلط
یقیناً بس کنڈکٹر کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اعظم نے جل تو جلال تو کا ورد کرنا شروع
کر دیا۔ لیکن شاید آنے والی بلا ٹلنے والی نہیں تھی۔ اس وقت اس کو اپنی بیوی کا
اصرار یاد آ رہا تھا، گھر سے نکلنے سے پہلے وہ بہت مجبور کر رہی تھی کہ بسم اللہ
پڑھ کر باہر قدم نکالو۔ ورنہ نقصان ہوتا ہے، لیکن وہ ہنس کے باہر نکل آیا۔
کنڈکٹر قریب آ رہا تھا۔ اس وقت اچانک ایک دلچسپ حادثہ پیش آیا اعظم کے
پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اُس سے پوچھا۔

"بابو صاحب! آپ کے پاس ایک پیسہ ہوگا۔ میرے کرایہ میں ایک پیسہ کم پڑ رہا ہے"۔

اعظم کو محسوس ہوا جیسے اس شخص نے بھری بس میں اس کی پتلون کھینچ لی ہے اور وہ ننگا ہو گیا ہے وہ ابھی کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ کنڈکٹر سامنے آ گیا اور ٹکٹ کے دام مانگے، اعظم نے اُسے نو پیسے دیتے ہوئے کہا۔

"یار اس وقت میرے پاس صرف نو پیسے ہیں ایک پیسہ کل وِل لے لینا"۔

کنڈکٹر نے ڈرائیور کو آواز دی۔

"علی شبیر ـــ روک کے ذرا"۔

اور پھر اعظم سے مخاطب ہو کر بولا۔

"نہ صاحب۔ یہ بس ہے کوئی بنیئے کی دوکان تو نہیں کہ آپ یہاں بھی ادھار چلائیں بس یا تو پورے دس پیسے دیجئے یا یہاں اُتر جایئے!"

"اعظم نے دیکھا کہ سارے بس کے مسافر اس کے گیبرڈین کے سُوٹ کو دیکھ رہے ہیں بعض شرافت آمیز انداز میں مُسکرا رہے ہیں۔ اعظم فوراً اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا بس کے ٹھہرنے تک اعظم نے اس قسم کے تبصرے سُنے۔

ایک "ذرا بابو صاحب کا سوٹ بوٹ دیکھو اور جیب میں ایک پیسہ نہیں"۔

دوسرا۔ "ارے میاں کنڈکٹر ایک پیسے کی کیا بات ہے بیچارہ مصیبت زدہ بے روزگار معلوم ہوتا ہے، لے چلو، رات کا وقت ہے"۔

تیسرا۔ "کبھی تم پر بھی ایسا وقت پڑے گا"۔

چوتھا۔ "ہاں بھئی لے چلو"۔

کنڈکٹر جس کا موڈ بہت خراب ہو چکا تھا۔ بولا۔

"نہ صاحب نہ، ادھر مالک ہم سے ایک ایک پیسے کا حساب مانگتا ہے۔

پانچواں۔ ہاں تمہارا مالک اسی طرح ایک ایک جوڑ کر دولت جمع کر رہا ہے۔

چھٹا۔ آہ! پاکستان کے باشندوں کی مالی حالت۔

ساتواں۔ اماں بھائی صاحب! آپ نہ اُتریں بیٹھے رہیں ایک پیسہ کیا میں آپ کا ٹکٹ لے لیتا ہوں۔

لیکن اعظم شرمندگی سے پسینہ پسینہ کوئی جواب نہ دیئے بغیر چُپ چاپ بس سے اُتر گیا جب بس دُور چلی گئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس نے یہ بہت ہی اچھا کیا جو بس سے اُتر گیا ورنہ اگر "ساتواں آدمی" اسے ایک پیسہ دے دیتا یا اس کا ٹکٹ لے لیتا تو پھر مہاجر بستی پہنچنے تک یعنی پورے پون گھنٹے بس کے اندر اسے بہت سی گھورتی ہوئی نظروں کی زد میں بیٹھنا پڑتا۔ اور ہر لمحہ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ فلاں گھورنے والا شخص اس کے بارے میں کیا رائے قائم کر چکا ہے یا کرنے والا ہے اعظم کا بُرا حال ہو جاتا۔ اب اعظم نے اطمینان کی سانس لی اُسے آٹھ میل پیدل چلنا منظور تھا لیکن بس میں اس طرح نگاہوں کا مرکز بننا، شرمندگی سے پسینے میں شرابور ہونا اور بے عزت ہونا منظور نہ تھا۔

چلتے چلتے اعظم کی نظر ایک بھکاری پر پڑی جو اسٹریٹ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں بیٹھا صدا لگا رہا تھا۔

"اندھے محتاج کو ایک پیسہ دیتے جاؤ بابا!"

"ایک پیسہ"

اعظم نے سوچا اس وقت اس میں اور اس اندھے بھکاری میں کیا فرق ہے ؟ دونوں کا سوال ایک پیسہ کا ہے؟ بلکہ ساری دنیا کا سوال پیسہ ہے اور ساری دنیا بھکاری ہے۔ ساری دنیا کو پیسہ کی ضرورت ہے اور دُنیا کی دولت جگہ جگہ ایک ایک پیسہ جوڑ کر اکٹھی کی جا رہی ہے کاش یہ دُنیا ایک پیسے کے محور پر نہ قائم ہوتی!

اندھے بھکاری کے قریب پہنچ کر اعظم نے دیکھا کہ اس کے سامنے کمبل کا ایک چوکور ٹکڑا پھیلا ہوا ہے جس پر دو تین آنے کی ریزگاری پڑی ہوئی ہے۔ اعظم کے دِل میں اس وقت ایک بُرا خیال آیا کہ اس وقت رات کا اندھیرا ہے۔ سڑک سنسان ہے اور بھکاری اندھا ہے۔ اگر وہ اس کے سامنے سے چپکے سے ایک پیسہ اُٹھا لے تو کیا ہرج ہے؟ اس معیوب حرکت کی تلافی کے لیئے اعظم اس بھکاری کو کل ایک اٹھنّی بلکہ روپیہ بھی دے دے گا۔ یہ سوچ کر اعظم اس کے قریب گیا اور چپکے سے جھک کر ایک پیسہ اُٹھایا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم اندھے بھکاری نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور چیخنے لگا۔

"چور! — چور! پکڑو! پکڑو!"

اعظم نے گھبرا کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی بڑی کوشش کی، لیکن اندھے کی پکڑ بڑی مضبوط تھی۔ اس کا شور سُن کر سامنے پان کی دوکان سے پانچ چھ سنڈے مسٹنڈے آ گئے اُنہوں نے حیران ہو کر اعظم کی طرف دیکھا جو ایک فرسٹ کلاس قسم کے گیبرڈین سوٹ میں ملبوس تھا۔ اعظم نے فوراً بات بنائی۔

"دیکھا بھائی صاحبان آپ لوگوں نے یہ جھوٹ موٹ کا اندھا ہے۔ میں تو صرف یہ معلوم کرنے کے لئے یہاں آیا تھا کہ آیا یہہ اندھا ہے یا نہیں لیکن جب

یُونہی تفریحاً میں نے ایک پیسہ اُٹھایا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اب آپ لوگ فرمایئے !"

اعظم نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی حالت تھی ۔شاید وہ لوگ اس کی بات پر یقین کر گئے ۔ اگر وہ اچھے کپڑوں میں ملبوس نہ ہوتا تو شاید وہ غنڈے مار مار کر اعظم کا بھرکس نکال دیتے ۔ ان غنڈوں نے اندھے کی گرفت سے اعظم کا ہاتھ چھڑا دیا اور اندھے پر ڈانٹ پھٹکار کی ایک آدمی نے کہا ۔

"بابوجی ۔ یہ صرف بھیک مانگنے کے لئے اندھے بن جاتے ہیں ، سالے ۔"

ایک فلسفی قسم کے غنڈے نے اندھے کی طرفداری کرتے ہوئے کہا ۔

"غریب آدمی اندھے ہونے کے باوجود اندھے نہیں ہوتے مسٹر! اندھے صرف امیر آدمی ہوتے ہیں اگر امیر آدمی آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے نہ ہوتے تو اس طرح انہیں کے بھائی بند سینکڑوں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں انسان کیوں بھیک مانگتے کیوں بے روزگار ہوتے کیوں بے موت مرتے رہتے اور آپ کیوں اس اندھے بھکاری کا ایک پیسہ اُٹھانے پر مجبور ہو جاتے ۔"

اس غنڈے فلسفی کا آخری جملہ تیر کی طرح اعظم کے دل میں چبھا اور اس نے دوسرے غنڈے کی طرف رحم اور مدد طلب نظروں سے دیکھا تو ایک غنڈے نے ترس کھا کر کہا ۔

"چلئے بھئی ، آپ جایئے ۔ چلو چلو ، آؤ یار ۔"

اعظم نے موقع غنیمت جانا اور السلام علیکم کہتا تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے بڑھ گیا جب وہ غنڈوں کی نظروں سے اُوجھل ہو گیا تو اس کے قدموں کی رفتار پھر سُست

پڑگئی۔ ایک طرح کے احساسِ ندامت سے وہ پانی پانی ہوا جا رہا تھا کہ اس نے کیسی ذلیل حرکت کی تھی! اگر وہ اچھے کپڑوں میں نہ ملبوس ہوتا تو نہ جانے وہ غنڈے اس کی کیا دُرگت بناتے اور پھر جو گالیاں خواہ مخواہ اس اندھے بھکاری کو پڑیں کیا وہ خود ان کا مستحق نہیں تھا؟ — اس بھکاری کی طرح آنکھیں رکھنے کے باوجود کیا وہ چند لمحوں کے لئے اندھا نہیں ہو گیا تھا —؟

کلاک ٹاور کی گھڑی نے گیارہ بجائے آگے جمشید روڈ سے مہاجر بستی تک راستہ خطرناک تھا۔ غنڈے اور چور اچکے اس راستے پر آئے دِن راہگیروں کو لوٹ لیتے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں صرف ایک پیسے کی خاطر ایک غنڈے نے ایک راہگیر کو چاقو مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ صرف ایک پیسہ کی خاطر!۔

اب تو اعظم کی جیب میں بھی صرف ایک پیسہ باقی رہ گیا تھا۔

پھر وہی ایک پیسہ!

یہ پیسہ بھی کتنی بڑی لعنت ہے کس مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس ایک پیسے نے۔!

اچانک اعظم کو یہ خیال آیا کہ وہ کیوں پیدل چل رہا ہے؟ وہ کسی رکشا یا گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر بھی تو اپنے گھر جا سکتا ہے۔ گھر جا کر کرایہ ادا کر سکتا ہے۔ یہہ صرف ایک پیسے نے اسے کتنا بدحواس کر رکھا ہے کہ اتنی معمولی سی بات اسے پہلے سمجھ میں نہ آئی اور وہ خواہ مخواہ بھری بس میں شرمندہ ہوا، اندھے بھکاری اور بازاری غنڈوں کے آگے ذِلّت اٹھائی!! بدحواسی محض بدحواسی! حد ہو گئی، بدحواسی کی انتہا ہو گئی۔

اپنی بدحواسی کو کوستے ہوئے اعظم نے سڑک پر سے گذرتی ہوئی ایک موٹر سائیکل رکشا کو آواز دی اور اس میں سوار ہو کر قدرے مطمئن ہو گیا کہ اب جمشید روڈ کے آگے سے شروع ہونے والے اندھیرے اور خطرناک راستے پر وہ اکیلا نہیں ہے۔

جمشید روڈ ختم ہو گئی اور اندھیرا اور خطرناک راستہ شروع ہوا۔ کافی دور جانے کے بعد اچانک موٹر سائیکل رکشا رک گئی۔ اعظم نے سمجھا غالباً رکشا میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے، لیکن جب موٹر سائیکل رکشا ڈرائیور نے جیب سے لمبے پھل والا ایک چاقو نکالا۔ تو اعظم سمجھ گیا کہ موٹر سائیکل رکشا خراب نہیں ہوئی ہے بلکہ موٹر سائیکل رکشا ڈرائیور بھی سیاسی رہنماؤں کی طرح راہبر کے بجائے راہزن ہوتے ہیں!

موٹر سائیکل ڈرائیور نے اس کی ناک کے عین سامنے چاقو چمکاتے ہوئے کہا۔

"جیب میں جو کچھ ہے نکالو ورنہ ...."

ورنہ موت سامنے کھڑی تھی اور روح فنا ہوئی جارہی تھی اعظم نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم میری تلاشی لے سکتے ہو۔"

اس نے تلاشی لی تو اس میں سے وہی بچے کھچے نو پیسے نکلے اور دس پیسے نہ ہونے کے باعث اعظم کو برسرِ عام شرمندگی اُٹھانی پڑی۔

رکشا ڈرائیور نے ان پیسوں کو دُور اندھیرے میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"آخ تھو۔ سالا نو پیسے کر رکشا میں بیٹھنے چلا ہے لیکن ہم جو وصول کرتا ہے وہ ضرور وصول کرے گا۔

چنانچہ نے اس نے اعظم کی ویسٹ اینڈ رسٹ واچ اور پارکر ففٹی ون فاؤنٹین

پن لے لیا اور گرج کر بولا:۔

"بھاگ جاؤ اب۔ ـــــ اگر شور مچاؤ گے تو یہ چاقو تمہارے کلیجے کے پار ہوگا۔"

اعظم کی گگھی بندھی ہوئی تھی، شور کیا مچاتا۔ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ اور موٹر سائیکل رکشا ڈرائیور رکشا پلٹ کر ہوا ہو گیا۔ اندھیرے میں اعظم اس کا نمبر بھی نہ نوٹ کر سکا۔

آدھی رات کو گھر پہنچ کر اعظم نے اپنی بیوی کو سارا واقعہ سنایا تو اس نے اپنی دور اندیشی اور دانش مندی کی دھونس جمانے کی خاطر کہا۔

"چلو روپے گئے کوئی حرج نہیں۔ جان تو بچی لیکن میں نے تمہیں پہلے ہی روکا تھا کہ بسم اللہ پڑھ کر گھر سے باہر قدم نکالو۔ مگر تم تو مجھے نری بے وقوف سمجھتے ہو۔ اب ذرا نظریں ملا کر تو بات کرو۔"

اعظم نے اس سے نظریں نہیں ملائیں لیکن وہ اس کی دانش مندی سے قطعاً متاثر نہیں ہوا تھا۔ اب یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے کہ اس حادثہ کا کوئی تعلق بسم اللہ سے بھی ہے یا ہو سکتا ہے؟

اس پیسہ پر دو حرف!

اس پیسہ پہ ہزار لعنت!

جانے انسان کب پیسے کے چنگل سے آزاد ہوگا؟

بسم اللہ

مولوی مسافرخانے کا شاعر

کراچی شہر کی ایک شاہراہ کا نام بندر روڈ ہے۔ اس بندر روڈ پر ایک جگہ ہے جس کا نام "مولوی مسافر خانہ" ہے۔ سُنتے ہیں کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے اس جگہ ایک مسافر خانہ تھا۔ جہاں صرف مولوی مسافر قیام فرمایا کرتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد نہ مسافر خانہ کہیں دکھائی دیتا ہے اور نہ مسافر مولوی نظر آتے ہیں۔ البتہ وہ جگہ مولوی مسافر خانے کے نام سے مشہور ہوگئی ہے۔ ویسے قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی مذہبی حیثیت کی مخالفت کرنے والے شر انگیزوں نے یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ پاکستان کوئی ملک نہیں بلکہ ایک بہت بڑا "مولوی مسافر خانہ" ہے لیکن پاکستان میں تحریک ختم نبوت سے متعلق ہنگاموں اور فسادات کے بعد حکومت پاکستان نے پاکستان کے مولویوں کو "اندر دے کر" اس شر انگیز پروپیگنڈے کی تردید کر دی کہ سارا ملک "مولوی مسافر خانہ"

آپ مولوی مسافر خانے کا اس قدر تفصیلی ذکر سُن کر یہ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ مولوی مسافر خانے کو بھی میں تاج محل، قطب مینار اور دیوارِ چین کی طرح کوئی عالمگیر شہرت رکھنے والی عمارت سمجھتا ہوں جبھی تو میں اس عمارت پر ایک مضمون لکھنے بیٹھ گیا۔ ایسا سوچنا دراصل آپ کی بے صبری اور تعجیل ہے۔ اور تعجیل کے بارے میں ہمارے محاورہ ساز بزرگوں نے یہ محاورہ بنایا ہے کہ تعجیل شیطان کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ شیطان نہیں ہیں اور میں بھی شیطان نہیں ہوں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ جب کبھی مولوی کا ذکر کہیں آجاتا ہے۔ تو شیطان کا ذکر بھی ضرور آجاتا ہے اس لئے کہ دونوں کا آپس میں بڑا گہرا اور پرانا رشتہ ہے۔ "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" میں شیطان سے پناہ مانگتا ہوں اور بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں دراصل مولوی مسافر خانے پر کوئی تحقیقی مضمون نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں تو دراصل یہ بتانے جا رہا تھا کہ کراچی شہر کی سب سے بڑی سڑک کا نام بندر روڈ ہے۔ اور اس بندر روڈ پر ایک جگہ ہے جس کا نام مولوی مسافر خانہ ہے اس کے آگے میں کچھ اور بتانا چاہتا تھا کہ بیچ میں مولوی آگئے اور ان کے پیچھے شیطان کود پڑا۔ آپ اور مجھ جیسے سادہ لوح انسانوں کو بہکانے کا کام چونکہ دونوں ہی انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ پہلے مولوی نے اور بعد میں شیطان نے مجھے بہکا دیا، اب جبکہ مولوی مسافر خانے کے بجائے جیل خانے میں بند ہیں اور اعوذ باللہ پڑھنے سے شیطان نو دو گیارہ ہو چکا ہے۔ میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

ہاں تو میں یہ بتانے جا رہا تھا کہ بندر روڈ پر ایک جگہ مولوی مسافر خانے کے نام سے مشہور ہے۔ اس جگہ پرانی اور درسی کتابوں، کمپاس بکس، سیاہی، فونٹین پن، پنسل ربڑ وغیرہ کی ایک چھوٹی سی دکان ہے یہاں سے مشہور ترقی پسند ادیب، شاعر اور اخبار نویس

حضرت صبا لکھنوی کا ترقی پسند ماہنامہ "افکارات پریشاں" بھی شائع ہوتا ہے اس دکان کا نام "ادبستان" ہے۔ درسی کتابوں اور طالب علموں کی ضروریات کی چیزیں فروخت کرنے والی اس دوکان کا نام ادبستان غالباً اس لئے رکھا گیا ہے۔ کہ اس کے مالک مرزا سعید بیگ لکھنوی بڑے ہی ادب اور ادیب نواز نوجوان ہیں۔ ان کی اس چھوٹی سی دوکان میں صبح سے لے کر شام تک ادیبوں کا ایک جمگھٹا سا لگا رہتا ہے۔ باہر سے دیکھنے میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں "نان اسٹاپ" قسم کے علمی ادبی جلسے اور مشاعرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ مرزا سعید بیگ چونکہ بڑے ہی ادیب دوست قسم کے انسان ہیں۔ اس لئے چائے، پان اور سگرٹ سے ادیبوں اور شاعروں کی تواضع میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ مثل تو آپ نے کاہے کو سُنی ہوگی جبکہ وہ مثل ہونے کے باوجود مشہور نہیں ہے۔ بہرحال چونکہ مثل ہے اس لئے آپ بھی سُن لیجئے۔ وہ مثل یہ ہے۔

"جہاں چائے، پان اور سگرٹ ہوتا ہے وہاں ایک غزل گو شاعر ضرور ہوتا ہے"

میں مرزا سعید بیگ کا بڑا ہمدرد دوست ہوں۔ اس لئے میں یہ کچھ پسند نہیں کرتا کہ مرزا صاحب اپنی دوکان کو اس طرح کسی ایرانی ہوٹل کی شاخ بنا کر اپنے کاروبار کو نقصان پہنچائیں۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اگر ان کی اس قسم کی "ادیب نوازی" اسی طرح جاری رہی تو کسی نہ کسی دن ان کا حشر سکندرِ اعظم سے بھی بُرا ہوگا ؎

سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

کہیں مرزا صاحب کے دنیا ہی میں دونوں ہاتھ خالی نہ ہو جائیں۔ میں نے ایک بار اشارتاً اور کنایتاً مرزا سعید بیگ کو یہ مشورہ دیا بھی کہ بھائی میرے! جب صبح دوکان پر آؤ تو پہلے "آیۃ الکرسی" پڑھ کر دوکان کے گرد حصار باندھ لو ورنہ کل کو کہیں سب مجھے

لوگوں کو یہ بُری خبر نہ سُنانی پڑے کہ

"بیچارے سعید بھائی! وہ جو بیچتے تھے درسی کتابیں اور کمپاس بکس
وہ دوکان اپنی بڑھا چکے ہیں اور رگِ گُل سے بلبل کے پر باندھنے
والے سارے شاعر اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ چکے ہیں"

میرا جہاں تک خیال ہے۔ سعید بھائی حد سے زیادہ بلکہ ضرورت سے زیادہ بامروت اور با اخلاق انسان ہیں جو موجودہ دور کی سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ اس قدر نیک انسان ہونے کے باوجود احکامِ خداوندی کی قطعاً پابندی نہیں کرتے، حالانکہ اللہ تعالے نے واضح طور پر تنبیہہ کی ہے کہ "ڈرو اس وقت سے جو آنے والا ہے"

میں نے کئی بار سعید بھائی کو یہ حکم خداوندی یاد دلایا لیکن وہ ہر بار "ہائے لکھنؤ" کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں نے نیک و بد سمجھاتے ہوئے انہیں صاف طور پر متنبہ کر دیا کہ "مانئے سعید بھائی حکم اللہ تعالے، ورنہ لگوایئے شوق سے دوکان پر تالا"

سعید بھائی کی دکان پر اگر ابراہیم جلیس جیسے عظیم المرتبت اور عالم گیر شہرت رکھنے والے ادیب آئیں یا مسعود عباس صاحب ایسے سخن فہم اور ادب دوست تشریف لائیں، یا پھر ماہنامہ "افکارات پریشان" کے مدیر حضرت صبا لکھنوی اس دکان کو اپنا یعنی اپنے ماہنامے کا مقامِ اشاعت بنا ڈالیں تو کوئی ہرج نہیں لیکن یہ کم بخت غزل گو شاعر "خواہ مخواہ بھاگل پوری" ان کی دکان پر کیوں آتا ہے۔

لیجئے اب میں آیا اپنے اصل موضوع کی طرف۔ یعنی میں اتنی دیر سے آپ کے صبر کا جو امتحان لے رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خواہ مخواہ بھاگلپوری سے تعارف سے پہلے

ایسی بور فضا پیدا کردوں کہ اس کا نام سُنتے ہی آپ کو اس سے ویسی ہی نفرت پیدا ہو جائے جیسی میرے دِل میں ہے۔ یہاں میں ایک بات کی وضاحت کردوں کہ خواہ مخواہ بھاگل پوری محض ایک فرضی تخلص ہے اصلی تخلص اس لئے نہیں بتانا چاہتا کہ اس سے شدید نفرت ہونے کے باوجود مجھے اس پر کبھی کبھی بڑا ترس بھی آتا ہے۔

خواہ مخواہ بھاگلپوری نے کبھی میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ اس نے مجھے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا لیکن پھر بھی مجھے اس سے شدید نفرت ہے کیوں ہے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ صرف خدا کی ذات جانتی ہے ویسے آپ میں سے ہر ایک کے جاننے پہچاننے والوں میں سے ایک ایک شخص ضرور ایسا ہوگا۔ جس سے آپ کو بغیر کسی وجہ کے نفرت ہوگی۔ کوئی آپ سے اس نفرت کی وجہ پُوچھے تو آپ واقعی کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ جواب دینے کے بجائے صرف بغلیں جھانکنے کا مجرب مشغلہ انجام دیں گے۔ یہی حال میرا بھی ہے۔ اس کو شاید "صحیح انعام" میں بغض للّٰہی یا خدا واسطے کا بیر کہا جا سکتا ہے۔

خواہ مخواہ بھاگل پوری سے میری نفرت کا آغاز ٹھیک اسی دن سے ہوا جس دن سعید بھائی نے اس سے میرا تعارف کرایا۔

خواہ مخواہ بھاگلپوری درمیانے قد کا ایک دُبلا پتلا، سیاہ فام اور چیچک رو شخص ہے جس کی عمر ۳۵۔ اور ۴۰ سال کے درمیان ہے اس کے گال پچکے ہوئے ہیں۔ جن کو وہ ہمیشہ دو ڈبل چونے اور کتھے اور مراد آبادی تمباکو والے پانوں سے پھولا رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کرنجی نیم وا آنکھیں جن کی پتلیاں خاکستری رنگ کی اور دیدے زردی مائل ـــــ ان خوبصورت آنکھوں پر وہ دوہرے تالوں اور موٹے فریم والا چشمہ لگاتا ہے۔ اس کے کوٹ ہینگر جیسے کندھوں پر ہمیشہ ایک بے حد

یلی کالی اچکن ٹنگی رہتی ہے جس کے باریک کالر سے اس کی پتلی لمبی گردن کو نکلا دیکھ کر شاید
نگلے بھی اپنی "دراز گلوی" کے دعوے سے باز آجائیں۔ اس کے منہ میں ہمیشہ ایک پائپ لگا
رہتا ہے جس کے منہ پر ایک ڈھکن بھی ہوتا ہے۔ اس پائپ میں وہ پائپ کے تمباکو کے
مختلف الاقسام کے سگریٹوں کے نرخوں کے تمباکو کا "کاک ٹیل" استعمال کرتا ہے۔ اس نے
شاید اپنی پیدائش پر دایہ کے ہاتھوں غسل کیا ہے۔ اور اب سوائے غسال کے اُسے کوئی
نہلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کے سر پر انگریز میموں جیسے لمبے لمبے بال ہیں۔ مجھے یقین ہے
کہ چھچھوندر نے اپنے سر میں کبھی نہ کبھی چنبیلی کا تیل ضرور لگایا ہوگا۔ لیکن خواہ مخواہ بھاگلپوری
نے اپنی زندگی میں نہ تیل دیکھا ہے اور نہ تیل کی دھار —— اُسے آپ جب دیکھئے یوں
محسوس ہوگا جیسے وہ پاکستان کے محکمہ جنگلات کا ملازم ہے جو اپنے سر پر پاکستانی جنگلوں
کا ایک نمونہ SAMPEL لئے گھوم رہا ہے۔

اس کے بارے میں میں صرف اتنا ہی جان سکا ہوں کہ صبح سویرے دیسی ٹھرے
کا خمار اترتے ہی وہ میونسپل کارپوریشن کے کسی سنڈاس میں "حوائج غیر ضروریہ" سے فارغ
ہو کر سیدھا سعید بھائی کے ادبستان پہنچ جاتا ہے اور جب ادبستان بند ہو جاتا ہے، وہ
بلا بادِل نخواستہ نہ جانے کون سے قبرستان چلا جاتا ہے۔ سعید بھائی سے اتنے گہرے
ہم پیالہ و ہم نوالہ قسم کے تعلقات ہونے کے باوجود وہ خود بھی نہیں جانتے کہ وہ کہاں رہتا
ہے کیا کام کرتا ہے۔ کہاں سے آتا ہے کدھر جاتا ہے (اور کیوں جاتا ہے؟)۔

میں نے ایک دن اس سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا تو اس نے مخصوص قسم کے
"غزل گویانہ انداز" میں جواب دیا:

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں کہاں رہتا ہوں البتہ جب کبھی

میں خود کو تلاش کرتا ہوں تو اپنے آپ کو فکر و شعر کی عمیق وادی میں

پاتا ہوں ۔"

میں نے پوچھا :۔

"آپ کے والدین، بھائی بہن، بیوی بچے اور دوسرے رشتہ دار کوئی نہیں ہیں کیا" ؟

اس نے شاید فکر و شعر کی عمیق وادی سے جواب دیا۔

"علم و ادب میرے والدین ہیں شاعری میری بیوی اور شعر میری اولاد ۔"

میں نے پوچھا۔

"آپ چونکہ غزل گو شاعر ہیں اس لئے آپ کی محبوبہ ضرور ہوگی۔"

اُس نے ایک سرد آہ بھر کر جواب دیا۔

"محبوبہ نہیں محبوب کہیئے حضور ۔ میں کوئی قرقی پسند شاعر یعنی (ترقی پسند

شاعر) نہیں ہوں کہ عورت سے محبت کروں ۔ اُردو کا شاعر ہوں ۔

وضعدار ہوں ۔ اپنی وضع نہ بدلوں گا ۔ ہائے میرے شوخ و شنگ

عبدالکریم !"

شوخ و شنگ عبدالکریم کے عاشق زار نے پھر میر تقی سے لے کر "غالب"

تک محبوبوں کے بیسیوں اشعار سُنا ڈالے ۔ اس نے چونکہ ترقی پسند ادب کو "قرقی پسند

ادب" کہا تھا۔ اس لئے میں نے اس سے پوچھا۔

"آپ کا موجودہ ادب کے متعلق کیا خیال ہے؟"

یہ سُنتے ہی ایک زہریلی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر آگئی، اور وہ بُرا سا

منہ بناتے ہوئے بولا :۔

"اب ادب رہا کہاں۔ اب تو صرف بے ادبی باقی رہ گئی ہے ادب کا جنازہ تو اسی دن پاکستان اور ہندوستان سے اٹھ چکا جس دن محترم اُستاد تفتیش بریلوی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد ان ترقی پسند ادیبوں نے ادب کی قرقی کرا دی"

میں نے پوچھا۔

"قبلہ! یہ حضرت تفتیش بریلوی کون بزرگ تھے؟"

اس نے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور پھر سعید بھائی اور صبا لکھنوی سے پوچھا۔

"کیوں سعید! یہ تمہاری دکان پر کیسے کیسے بد ذوق جمع ہو جاتے ہیں"

مجھے بڑا غصہ آیا مگر مجھے ذرا تفریح لینے کا موڈ آچکا تھا۔ اس لئے میں نے غصہ پیتے ہوئے معذرت کی۔

"قبلہ میں چونکہ ادیب وریب نہیں ہوں۔ ایک جاہل آدمی ہوں، البتہ کچھ پڑھنے پڑھانے کا شوق ہے اس لئے میری بد ذوقی کو معاف فرمایئے لیکن یہ تو بتایئے کہ جوش، جگر، فراق اور فیض احمد فیض کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس نے بڑی رعونت سے پائپ کا دھواں اُڑاتے ہوئے کہا۔

"برخوردار۔ ان کو شاعر کہنا یا سمجھنا شاعری کی توہین ہے یہ تو محض تک بند ہیں جنہوں نے اپنا گھپلا کر کے شہرت حاصل کر لی ہے اور یہ جگر کے بارے میں تو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کا آدھے سے زیادہ دیوان ایسا ہے۔ جس پر اُستاد محترم حضرت تفتیش بریلوی نے

نہ صرف اصلاح دی ہے بلکہ غزلوں کی غزلیں اُن کی کہی ہوئی ہیں۔
جنہیں علی سکندر یعنی آپ کا جگر مرادی بھانڈوں کی طرح جگہ جگہ سے
اپنے نام سے سُناتا پھرتا ہے۔ ہونہہ!"
میں نے اپنی ہنسی کو بمشکل ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔
"آپ چونکہ بڑے جید عالم ہیں اس لیئے آپ نثر کا بھی مطالعہ کرتے ہوں گے
آپ کا کرشن چندر۔ سعادت حسن منٹو۔ عصمت چغتائی۔ اور احمد ندیم
قاسمی کے بارے میں کیا خیال ہے۔"
ان ناموں کو سُن کر ناک سکیڑتے ہوئے اور اس میں سے ایک چھیچڑ برآمد کرتے
ہوئے اس نے جواب دیا۔
"یہ لوگ ادیب ہیں؟ میں نے تو ان لونڈوں کا نام بھی کبھی نہیں سُنا
— اُستادِ محترم حضرت تفتیش بریلوی سچ فرماتے تھے کہ بہت جلد وہ
دور آنے والا ہے جبکہ اس ملک کے بھنگی اور سقّے اور قلعی گر تک اپنے
آپ کو ادیب کہلوائیں گے۔"
اس پر مجھے غصہ آگیا اور میں نے اُٹھ کر ایک زوردار تھپڑ خواہ مخواہ بھاگل پوری
کے منہ پر رسید کیا۔ ابھی دو چار تھپڑ اور رسید کرنے کا ارادہ تھا کہ سعید بھائی اور صبا
لکھنوی نے بیچ بچاؤ کیا اور مجھے دوکان سے باہر لے کر چلے گئے۔
اس دن کے بعد سے مجھے ادبستان جانے کا کبھی موقع نہیں مل سکا لیکن ایک
نہ ایک دن جاؤں گا۔ اور میرے ذمہ خواہ مخواہ بھاگل پوری کے منہ پر برسنے والے تھپڑ
جو باقی رہ گئے ہیں۔ ان کی ادائیگی کر دوں گا۔ ممکن ہے آپ مجھے مشورہ دیں کہ خواہ مخواہ

بھاگل پوری جیسے کمزور انسان پر ہاتھ اُٹھانا معیوب بات ہے۔ مگر میں بھی کیا کروں، ان دنوں امریکی گندم کھاتا ہوں اور کمزور پر وہی شخص ہاتھ اُٹھاتا ہے جو امریکی گندم کھاتا ہو۔

دروازہ کھٹکھٹانا!

"کھٹ کھٹ کھٹ ——— زہرہ دروازہ کھولو"

"میں ہوں عبید ——— کھٹ کھٹ"

اس کھٹ کھٹ اور اس آواز سے ہر روز رات کو میں ہڑبڑا کر جاگ پڑتا ہوں حالانکہ میں زہرہ نہیں ہوں اور عبید بھی میرے گھر میں نہیں رہتا۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ عبید اور زہرہ میرے پڑوسی ہیں اور یہ کم بخت عبید کہیں رات کی ڈیوٹی انجام دیتا ہے، یا محض نرا آوارہ ہے جو آدھی رات سے پہلے کبھی گھر نہیں لوٹتا اور اس زور سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے کہ آدھا محلہ جاگ پڑتا ہے اور آدھے محلہ کو عبید سے ملے اور زہرہ کو دیکھے بغیر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس محلہ میں عبید اور زہرہ نام کے دو زن و شوہر رہتے ہیں۔ میں اس محلہ میں پچھلے ایک سال سے رہتا ہوں لیکن آج تک میں نے عبید کی صورت نہیں دیکھی ویسے اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی بہت خواہش ہے، صرف اس لئے کہ اسے

یہ نصیحت کرو کہ بندۂ خدا اتنی رات گئے اتنی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا کر سارے محلہ کو جگا دینا شہری طرزِ زندگی یا CIVICS-SNCE کی صریح خلاف ورزی ہے۔ CIVICS-SNCE کا صحیح اردو ترجمہ کیا ہے مجھے معلوم نہیں میں عبید کی بیوی سے چونکہ مل نہیں سکتا، ورنہ اس کو بھی سمجھاتا کہ جوان عورت کو کسی گھر میں تنہا ایسی گہری نیند نہیں سونا چاہیئے کہ . . . بہت کچھ ہو سکتا ہے کہ آگے لکھنے یا کہنے کو تہذیب اجازت نہیں دیتی، جوانی میں سب ہی عورتیں مست نیند سوتی ہیں اور سب ہی آوارہ مرد گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں۔ لیکن اس طرح بھی نہیں کہ اڑوس پڑوس کے مرد اور عورتیں اور چھوٹے بچے جاگ پڑیں، چھوٹے بچے ڈر کر رونے لگیں اور مرد بڑبڑائیں اور عورتیں کوسنا شروع کر دیں کہ کون ہے یہ آوارہ نگوڑا مردوا جو ہر رات ہماری نیند حرام کر دیتا ہے۔!

مجھے یقین ہے کہ اگر مسٹر عبید وزیروں اور امیروں کے محلہ یعنی سائلنٹ زون (SIELENT ZONE) میں رہتا ہوتا تو پھر کبھی کا وہ جیل میں ہوتا اور اس کی زہرہ میکے میں بیٹھی ہوتی اور زہرہ کے والد بن عبید سے اس کو طلاق دلا کر دوسری شادی کرانے کی فکر میں مبتلا ہو جاتے ____ اور یہ اتنا بڑا حادثہ صرف اتنی سی بات پر ہو جاتا کہ عبید کو اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا نہیں آتا۔

یوں بظاہر تو دروازہ کھٹکھٹانا ایک معمولی سا فعل ہے دنیا کے کسی انسان نے سوائے میرے، اس کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی ہوگی، بلکہ کسی نے آج تک کبھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ وہ دروازہ کیوں کھٹکھٹاتا ہے۔ کس کے پاس اتنی فرصت ہے کہ وہ ایسی فضول باتوں پر

تھپ تھپا دیا، اور دروازہ کھُل گیا، اس کے لئے سوچنے کی کیا ضرورت! لیکن میں سمجھتا ہوں، کہ دروازہ کھٹکھٹانا ہمارا ایک ایسا فعل ہے جو ہماری موجودہ فیشن ایبل طرزِ زندگی میں بڑا اہم کارنامہ ہے۔ اگر ہمیں طریقہ پر دروازہ کھٹکھٹانا نہیں آتا تو نہ صرف ہمارا شمار فیشن ایبل اور مہذّب انسانوں میں نہیں کیا جائے گا بلکہ ہمیں انسانوں کے رہنے بسنے کے اجتماعی بزم و شعور سے بھی عاری قرار دیا جائے گا۔ اور اگر دنیا کے اخلاق دن بدن نرم و نازک ہوتے چلے گئے تو وہ دِن دور نہیں جب ہمیں صرف اس الزام پر شہری آبادی سے خارج کر کے جنگل یا دیہات میں نظر بند کر دیا جائے گا کہ ہم زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا کر اپنے پڑوسیوں کا دن کا چین اور رات کی نیند حرام کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا کرتے تھے۔

3 خدا مجھے اور آپ کو اور سب کو اس روزِ بد سے بچائے اور سب کو عبید شوہر زہرہ کے نقشِ قدم پر چلنے سے باز رکھے۔ آمین 4

ابھی ہمارے ملک میں تہذیب نے اتنی نرم و نازک صورت اختیار نہیں کی ہے۔ کہ شوہر عورت کے بیڈ روم یا خواب گاہ میں داخل ہونا چاہے تو پہلے دروازہ کھٹکھٹائے اور جب بیوی اجازت دے تو اندر داخل ہو، یہ تہذیب امریکہ، برطانیہ اور سارے یورپی ممالک میں رائج ہے ممکن ہے کہ ہمارے مُلک کے لوگ یہ سُن کر حیران ہو جائیں کہ یہ کیسی تہذیب ہے؟ کہ بیوی کے سونے کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے شوہر دروازہ کھٹکھٹاتے لیکن کیا کیا جائے یہ تہذیب ہے۔ اور رائج ہے ہمارے ملک والے ابھی اتنے مہذّب نہیں ہوئے کہ بیوی الگ کمرے میں سوتے اور میاں الگ کمرے میں، ہم لوگ چونکہ غیر مہذّب ہیں۔

سوتے ہیں، اور سونے کے کمرے میں داخل ہونے کے لئے نہ بیوی دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور نہ شوہر، دونوں بے دھڑک اندر داخل ہو جاتے ہیں، اس بد تہذیبی اور بد تمیزی کے کئی وجوہات ہیں لیکن جو وجوہات مجھے معلوم ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) ہم لوگ چونکہ مسلمان ہیں اور ہمارا سلسلۂ نسب عربوں سے ملتا ہے اس لئے ہم اپنے آباؤ اجداد کے محاورے پر پوری طرح عمل کرکے اپنی برخورداری اور سعادت مندی کا ثبوت پیش کرتے ہیں، ہمارے عرب آباؤ اجداد کا مشہور و معروف محاورہ یہ ہے

"مالِ عرب پیشِ عرب"

واضح رہے کہ ہمارے ملک میں بیوی کا شمار بھی "مال" میں ہوتا ہے،

(۲) ہمارے ملک کی آبادی زیادہ اور مکانات کم ہیں، ننانوے فی صدی لوگ دو تین کمروں میں پورے کنبہ کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اب ان دو تین کمروں کے مکان میں سے ایک کمرہ شوہر لے اور دوسرا بیوی تو پھر ماں باپ ساس خسر بھائی بہن اور دوسرے رشتہ دار کہاں سڑک کے فٹ پاتھ پر سوئیں؟ اس مکانی قلت کا تو ہمارے ملک میں یہ عالم ہے۔ کہ باپ بیٹا، بہو بیٹی داماد نوجوان لڑکیاں اور نوجوان لڑکے اور دوسرے رشتہ دار ایک ہی کمرے میں رہنے پر مجبور ہیں، اور پھر بیٹا اور بہو غنڈہ ایکٹ میں گرفتار ہوتے ہیں تو بیٹی اور داماد قانونِ عصمت فروشی میں دھر لئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد گھر کے دوسرے لوگ انہیں حوالات کے آہنی دروازے سے باہر نکالنے کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے پھرتے ہیں۔

برطانیہ امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک میں چونکہ آبادی کم ہے اور مکانات زیادہ ہیں اس لئے وہاں میاں بیوی الگ کمرے میں رہنے کو نہ صرف صحت کے لئے

مفید بلکہ مروجہ تہذیب کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں اور اس کی خلاف ورزی پر کبھی انہیں بڑے بڑے بھاری نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں چنانچہ پچھلے دنوں ایک امریکی عورت اور اس کے شوہر کا ایک واقعہ نیویارک کے اخباروں میں شائع ہوا تھا اور دنیا کے سارے اخبارات میں نقل ہوا تھا' وہ واقعہ یہ تھا کہ کسی تجارتی فرم کا ایک منیجر مسٹر جوزف ڈکسن ۲۶ ستمبر ۱۹۵۲ء کی رات کوئی دو بجے کے قریب اپنی بیوی ڈورو تھی کے کمرے میں بغیر اجازت داخل ہو گیا تھا جس سے مادام ڈورتھی کی گہری نیند خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے صبح مادام ڈورتھی نے عدالت میں اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرنیکی درخواست کی' عدالت نے درخواست منظور کر لی اور ڈورتھی کو ہمیشہ کے لئے اس کے "جنگلی" شوہر سے نجات دلا دی۔ جوزف ڈکسن عدالت کا یہ فیصلہ سن کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا' لیکن اس کے دوست دشمن اس کا مذاق اُڑا رہے تھے کہ ـــــــ مورکھ اب روتا کیوں ہے ؟ کیوں نہ کھٹکھٹایا دروازہ' پہلے اپنی بیوی کی خواب گاہ ـــــــ ! اب بیٹھ اس طرح اور روتا رہ ساری عمر ـــ جنگلی کہیں کا ؟

دیکھیے اس زمین پر اسی دنیا میں ایک ملک ایسا بھی ہے جہاں شوہر اپنی بیوی کی گہری نیند خراب نہیں کر سکتا' ورنہ دھو لیتا ہے اس سے ہاتھ عمر بھر کے لئے' اور ایک اپنا ملک بھی ہے جہاں میاں عبید آدھی رات کو زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا کر نہ صرف اپنی زہرہ کی مست نیند خراب کرتے ہیں بلکہ اطراف کے بیس پچیس گھروں میں رہنے والے مردوں عورتوں اور بچوں کو جگا دیتے ہیں۔ نہ مست خواب زہرہ ان سے طلاق حاصل کرتی ہے۔ اور نہ اڑوسی پڑوسی قانون کی مدد حاصل کرکے عبید میاں کو شہر بدر کرا سکتے ہیں ہمارے ملک میں ابھی چونکہ قوالیاں ٹھونکنے' ایمپلی فائر سے گراموفون ریکارڈ بجانے اور

رات کے پچھلے پہر بھی موٹر سائیکل کا اسٹارٹ ٹرائل لینے کی پوری آزادی ہے تو زور سے دروازہ کھٹکھٹانے پر کیا پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ اگر کچھ کیا جا سکتا ہے تو صرف یہی کہ عبید میاں سے یہ درخواست کی جائے کہ بھائی اگر تمہیں ہر روز آدھی رات کو گھر لوٹنا لازمی ہے تو پھر اپنے گھر باہر سے تالا ڈال کر جایا کرو، یا پھر اپنی بیوی کو ہدایت کردو کہ وہ دِن بھر خوب سویا کرے، تاکہ رات کو نیند نہ آئے اور پھر تم کبھی آؤ۔ اور ایک آواز لگاؤ۔

"زہرہ ——— !"

تو جھٹ سے دروازہ کھُل جائے اگر عبید میاں سمجھدار آدمی ہوا اور اس کو عام شہری طرزِ زندگی گذارنے کا ڈھنگ آتا ہو، یعنی اس میں (CIVICS SENCE) ہو تو وہ آپ کی بات مان لے گا، لیکن اگر وہ ٹیڑھا آدمی ہو تو بلاشبہ اکڑ جائے گا اور کہے گا۔

"جاؤ میاں جاؤ ——— اپنا راستہ لو، بیوی میری اور دروازہ میرا، میں ان دونوں کو جس طرح سے چاہوں کھٹکھٹاؤں! آپ کون ہوتے ہیں پاٹے خاں کی اولاد کہ میرے گھریلو معاملات میں دخل دیں، میں آپ کے گھر کا دروازہ تو نہیں کھٹکھٹاتا ——— ! آپ کی بیوی کو تو نہیں جگاتا ——— !"

ظاہر ہے کہ اس کٹھ حجتی کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں۔ آپ مجبوراً خون کے گھونٹ گٹک کر خاموش ہو جائیں گے اور گھر لوٹ کر اپنے کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور اپنی بیوی سے کہیں گے۔

"کم بخت بڑا بدتمیز ہے اسے کہیں جنگل میں رہنا چاہیے ——— نرا دیہاتی گنوار"

اور پھر جب رات کو یعنی آدھی رات کو عبید اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے تو آپ لاحول پڑھتے ہوئے جاگیں گے اور سوچیں گے ۔

کم بخت بھوت کا نواسہ ! اس سے تو علی بابا کے دشمن وہ چالیس چور ہی بڑے شریف تھے جو خفیہ خزانے کے دروازے پر جا کر دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے بلکہ دھیرے سے کہتے ۔

کھُل جا سِم سِم

اور خفیہ خزانے کا دروازہ کھُل جاتا ۔

افسوس کہ یہ زمانہ علی بابا اور چالیس چور کا زمانہ ہوتے ہوئے بھی کنڈی اور تالا چابی کا زمانہ ہے، کاش وہ چالیس چور مرنے سے پہلے "کھل جا سم سم" کا نسخہ اپنی اولاد کے حوالے کر جاتے تو یہ اُجڈ گنوار عبید میاں اس طرح ہر رات ہماری نیندیں نہ حرام کرتا، اور اگر کبھی علی بابا کے بھائی محمد قاسم کی طرح یہ طلسم فراموش کر دیتا۔ تو ساری رات نہ صرف وہ باہر سردی میں ٹھٹھرتا رہتا، بلکہ اس کی بیوی زہرہ اور اڑوس پڑوس کے پچاس گھر آرام سے گہری نیند سوتے رہتے ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ملک میں سب ہی لوگ عبید کی طرح بدتمیزی سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں جیسے کسی غیر کا گھر ہو ۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک میں تین قسم کے ایسے بھی باشندے ہیں جو راتوں کو کبھی دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے بلکہ دیوار یا کھڑکی پھاند کر اندر داخل ہوتے ہیں وہ اصحاب وہ خواتین یہ ہیں ۔

۱ - چور اور چورنی

۲ - محبوب اور محبوبہ

۴۔ آوارہ طالب علم جو ماں باپ اور ہوسٹل کے وارڈن کے سو جانے کے بعد سینما کا آخری شو دیکھتے ہیں۔

ان کے علاوہ ہندوستانی اسٹنٹ فلموں کے ہیرو ماسٹر ڈھٹل اور بلیموریا کا بھی نام لیا جا سکتا ہے، جو راجکماری سے اس کے محل میں معاشقہ لڑانے کے لئے جاتے ہیں اور کبھی دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے اور پھر یہ لوگ دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے گانا گاتے ہیں۔

تیرے ساجن آئے دوارے　　　　اُٹھ سجنی کھول کواڑے

ہمارے ملک میں اس طرح دروازہ نہ کھٹکھٹا کر گھروں میں داخل ہونے والوں کی خاصی تعداد ہے، اور ان میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے مگر ہمارے ملک کو ان سے اتنا اندیشہ نہیں جتنا اُن بیرونی باشندوں سے خطرہ ہے، جن کے نام ہمارے سابق وطن ہندوستان کی تاریخ میں بھی درج ہیں، ہماری تاریخ میں جگہ جگہ یہ لکھا ہے کہ بیرونی بادشاہ اور ان کی فوجیں جب کبھی ہمارے ملک میں داخل ہوئیں انہوں نے کبھی ہمارے ملک کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا سیدھے درّاتے ہوئے چلے آئے اور ہم پر حاکم بن بیٹھے، چنانچہ آریہ آئے ـــ انہوں نے بھی دروازہ نہیں کھٹکھٹایا، سکندر اعظم آیا اس نے بھی دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری آئے انہوں نے بھی دروازہ نہیں کھٹکھٹایا، مغل آئے انہوں نے بھی دروازہ نہیں کھٹکھٹایا اس کے بعد انگریز آئے انہوں نے بھی دروازہ نہیں کھٹکھٹایا، اور نہ صرف بغیر دروازہ کھٹکھٹائے آئے، بلکہ پورے ڈیڑھ سو سال تک ملک کے سارے دروازوں پر پہرہ بٹھا دیا اور ہم اس ملک کے اپنے باشندے تھے کہ اپنے ہی گھر کے دروازے کے باہر دھکیل دیئے گئے اور پھر پورے ڈیڑھ سو سال تک ہم اپنے ہی گھر کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے تب کہیں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دروازہ کھلا اور

ہم اپنے گھر میں داخل ہوئے ۔

اب سُنا ہے کہ ایک اور گورا ہمارے ملک کے دروازے کھٹکھٹا رہا ہے۔ وہ بھی چونکہ انگریز کا بھائی ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ اگر کہیں ہم نے دروازہ کھول دیا تو پھر مزید ڈیڑھ سو سال تک ہم خانماں برباد ہو جائیں گے ۔ اس لئے

گل کرو شمعیں بڑھاؤ مے و مینا و ایاغ

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

ورنہ پھر یارو! زندگی بھر پچھتانا پڑے گا!! میں تمہاری حمیت تمہارے ضمیر اور تمہاری قومی غیرت کے دروازے کھٹکھٹا رہا ہوں ......

کھٹ ۔ کھٹ ۔ کھٹ ....

آٹوگراف

دُنیا کے بڑے آدمی دو چیزوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ ایک تو غیر طبعی موت اور دوسری آٹوگراف بک ——— چنانچہ میں اکثر یہ دیکھتا ہوں کہ وہ جب کبھی کسی پبلک مقام پر آتے ہیں تو خاص طور پر اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ اُنہیں مشتبہ لوگوں اور آٹوگراف شکاریوں سے محفوظ رکھا جائے۔ لیکن یہ بھی میرا مشاہدہ ہے کہ بڑے اور مشہور آدمی مشتبہ لوگوں کی بندوق اور پستول کی گولی سے اکثر بچ جاتے ہیں لیکن وہ آٹوگراف شکاریوں سے کبھی نہیں بچ سکتے۔ آٹوگراف شکاری بالعموم اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکیاں اور لڑکے ہوتے ہیں جن کے بارے میں ساری دُنیا میں یہ مشہور ہے کہ شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا ہے تو بڑے اور مشہور آدمی کا کیا ذکر ——! ویسے شیطان خود بڑا نہ سہی لیکن ساری دنیا میں مشہور ہے۔ جبھی تو کسی کی شہرت کے بارے میں اندازہ لگاتے وقت یہ محاورہ بولا جاتا ہے کہ

"ارے وہ تو شیطان سے بھی زیادہ مشہور ہے"

یہاں شیطان کا ذکر صرف برسبیل تذکرہ آگیا ہے ورنہ "شیطان را بہ آٹوگراف چہ کار"

مگر ایک بات ہے آٹوگراف شکاری اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب کہ ساری دنیا کے بچے علم کی روشنی سے مستفید ہو رہے ہیں اور وہ دنیا کے ابتدائی ادوار کے بچوں کی طرح جاہل نہیں ہیں، اس لئے مجھے یقین ہے کہ اب اگر انہیں کہیں شیطان نظر آجائے تو وہ اس کے کان وان نہیں کاٹیں گے بلکہ اپنی اپنی آٹوگراف بک اس کے سامنے پیش کر دیں گے۔ لیکن اس حسن سلوک کے باوجود بھی شیطان اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے گا، یا اپنے کان کھجائے گا۔ کیونکہ یہ راز تو دنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ شیطان کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔ اگر شیطان کو پڑھنا لکھنا آتا تو پھر وہ شیطان کاہے کو ہوتا کم ازکم کوئی رجعت پسند ادیب تو ضرور ہوتا۔

موجودہ دنیا میں جہاں علم کا نور ماسکو جیسے ترقی یافتہ شہر سے لے کر کھٹمنڈو جیسی پس ماندہ آبادی تک پھیل گیا ہے۔ کتاب زندگی کا لازمہ بن گئی ہے۔ اب شاید دنیا کا کوئی ایسا گھر ہو جہاں کوئی کتاب نہ ہو۔ اسی طرح بہت کم طالب علم ایسے ہوں گے جن کے پاس آٹوگراف بک نہ ہو۔ پھر کم ازکم جس گھر کے والدین کے پاس ایک بھی چیک بک ہو تو پھر یقیناً اس گھر کے بچے کے پاس آٹوگراف بک بھی ضرور ہوگی۔

دنیا کے بڑے اور مشہور آدمیوں کے آٹوگراف حاصل کرنا موجودہ دنیا کے خوش حال والدین کے بچوں کا ایک محبوب مشغلہ ہے۔ یوں تو ڈاک کے ٹکٹ بہترین تصویریں، ماچس اور سگرٹ کی ڈبیوں کے لیبل اور ملک ملک کے نئے اور پرانے سکے وغیرہ جمع کرنا بھی موجودہ دنیا کے طالب علموں کے محبوب مشغلے ہیں۔ لیکن بڑے آدمیوں کے آٹوگراف جمع کرنے کے شغلے نے عالمگیر مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ لڑکیاں اور لڑکے اس کے لئے بڑی جدوجہد کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی بڑا آدمی کسی منظر عام پر آتا ہے تو اس کا آٹوگراف حاصل کرنے

کے لئے اکثر اوقات اُنہیں بزرگوں کی گھڑکیاں بھی سُننی پڑتی ہیں اور کبھی کبھی پولیس کی لاٹھیاں بھی کھانی پڑتی ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ اس کے باوجود وہ بڑا آدمی ان ننھے شکاریوں کی آٹوگراف کاپیوں کے جال سے بچ کر نکل جائے۔ میں کراچی کے ایک رئیس زادے طالب علم مسٹر حسن علیخاں کو جانتا ہوں جو حسینۂ عالم مس آرمی کو سیلا کا آٹوگراف لینے کے لئے کراچی سے جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو تشریف لے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ میری یہ بات یہاں مبالغہ سے ہم آغوش نظر آتی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آٹوگراف شکاری آٹوگراف کی خاطر کبھی کبھی اپنی پیاری جان کو بھی خطرے میں ڈالنے سے باز نہیں رہ سکتا، چنانچہ میری اپنی زندگی کا ایک ایسا ہی واقعہ ہے۔ ہوا یہ تھا کہ مرحوم ریاست حیدرآباد دکن کے ایک وزیرِ اعظم مہاراجہ کشن پرشاد بسترِ مرگ پر لیٹے ہوئے تھے اور سارے حیدرآباد میں یہ شہرہ تھا کہ بس اب ان کا چل چلاؤ ہے۔ اب گئے اور تب گئے میں نے سوچا کہ کم از کم اب ان کا آٹوگراف لے لینا چاہیئے ورنہ پھر ہمیشہ کے لئے کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ چنانچہ میں کسی نہ کسی طرح ان کے بسترِ مرگ تک پہنچ گیا اور ان کے آگے فاؤنٹین پن اور آٹوگراف بک بڑھادی۔ ان کے رشتہ داروں مصاحبوں اور نوکروں کو جب معلوم ہوا تو اُنہیں بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ جیسے میں کوئی مذاق کرنے آیا ہوں اس پر ان لوگوں نے مجھے اتنا مارا کہ میں بیہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ مہاراجہ کشن پرشاد آٹوگراف دیئے بغیر ہوش و حواس کی دنیا سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ اس واقعہ کو بھی سخن سازی پر محمول کریں گے لیکن ایمان سے یہ سخن سازی نہیں ہے۔

بڑے آدمیوں کے آٹوگراف حاصل کرنے کا شغل ایک حد تک ایک عالمگیر وبا کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ اس وبا میں دنیا کی ہر خوش حال لڑکی اور لڑکا مبتلا ہے یہاں

یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر بڑے آدمیوں کے دستخط میں ایسی کیا خوبی ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کے لئے اسکول کا طالب علم اتنا بے چین رہتا ہے؟ اس سوال کا جواب بلکہ کئی جواب ہو سکتے ہیں لیکن معقول جواب آج تک نہیں مل سکا۔ کسی حد تک معقول جواب ہو سکتا ہے کہ دنیا کے ہر بڑے آدمی کی ہر چیز بڑی قیمتی اور ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھے جانے کے لائق ہوتی ہے چاہے وہ اس کے ٹیڑھے بھینگے دستخط ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسری بات ہے کہ آٹوگراف بک "پند پند" قسم کی کتابوں کی طرح ایسا "نصیحت نامہ" ہوتی ہیں جو اسکول کے نوعمر طالب علموں کے خام ذہنوں پر ایسا اچھا اثر ڈالتی ہیں جو ان کی مستقبل کی زندگی کو سنوارنے میں مدد دیتی ہیں چنانچہ میں ایک اور بات بتاؤں کہ جب میں اسکول کا طالب علم تھا ان دنوں مجھے ہندوستان کے مشہور شاعر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا آٹوگراف لینے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر ٹیگور نے آٹوگراف دینے سے پہلے لکھا۔

"کردار انسان کی تقدیر ہے۔ ٹیگور"

یہ جملہ میرے موم جیسے خام ذہن پر پتھر کی لکیر کی طرح ثبت ہو گیا۔ چنانچہ اب پندرہ بیس گذر چکے ہیں۔ پتہ نہیں وہ آٹوگراف بک کہاں ہے؟ لیکن ڈاکٹر ٹیگور کی وہ نصیحت مجھے ابھی تک یاد ہے اور اس نے جیسے بچپن ہی سے میری زندگی بدل دی۔ اور اب کم از کم میں ایک صاحب کردار نہ سہی بد کردار بھی نہیں ہوں اور کردار میری قسمت کو دن بدن بناتا چلا جا رہا ہے ـــــ اسی ایک آٹوگراف کے حوالے سے میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ کبھی کبھی ایک آٹوگراف ایک انسان کی زندگی کو یکسر بدل دیتا اور بہتر بنا دیتا ہے۔ بحیثیت مجموعی میری نظر میں آٹوگراف بک ایک ایسی مشفق ماں ہوتی ہے جو ہر دم اپنے بچوں کو نصیحت کرتی رہتی ہے تا کہ وہ ان نصیحتوں کی روشنی میں اپنی زندگی کو صحیح ڈگر پر ڈال سکیں۔

اگر ایک طرف آٹوگراف بُک لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ناصح اور مشعل راہ حیات کا کام دیتی ہے تو دوسری طرف وہ بڑے آدمی کی حاضر دماغی کی بھی ایک امتحان گاہ ہے۔ آٹوگراف بُک ایک نہایت مختصر ترین عرصے کے لئے بڑے آدمی کے پاس جاتی اور اسی مختصر ترین لمحے میں حاضر دماغ آدمی کوئی معرکتہ آلارا جملہ یا شعر لکھ کر اس طرح دستخط کرتا ہے جیسے اپنی حاضر جوابی کا سکہ بٹھا رہا ہو۔ اس کے برعکس غیر حاضر دماغ بڑا آدمی صرف دستخط ثبت کر کے گویا مکھی مارتا ہے۔ اس بات کا پتہ لگانے کے لئے کون بڑا آدمی ہر وقت حاضر دماغ اور کون ہر وقت غائب دماغ رہتا ہے۔ آٹوگراف بک بڑی مفید ثابت ہوتی ہے۔ اور تو اور بعض ماہر نفسیات آٹوگراف کے ساتھ لکھے ہوئے جملوں اور اشعار سے بڑے آدمی کی موجود الوقت ذہنی کیفیت اور حالت بلکہ کردار کا بھی اندازہ لگاتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان کی مشہور شاعرہ اور "خطیبۂ ہند" سیدہ اختر نے ایک آٹوگراف بُک پر یہ جملہ لکھا تھا۔

"کہاں تک لکھوں؟ اور کیا لکھوں؟ اور پھر لکھنے سے فائدہ! جب پڑھنے والی نگاہوں کی تو افراط ہے اور محسوس کرنے والوں کا فقدان"

سیدہ اختر خطیبۂ ہند
۲ راگست ۱۹۴۷ء

اس آٹوگراف سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ خطیبۂ ہند لکھنے لکھانے سے عاجز آگئی ہیں اور انہیں اپنے قارئین کرام سے شدید مایوسی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس کے باوجود وہ مایوسی کو کفر سمجھتی ہیں اور برابر اور بے تحاشا لکھے جا رہی ہیں۔

ایک نوجوان لڑکی کے ایک آٹوگراف بُک پر ایک شاعر صاحب نے جن کا نام مصلحتاً حذف کیا جا رہا ہے۔ جانتے بوجھتے ہوئے کہ یہ ایک اجنبی لڑکی کی آٹوگراف بُک ہے یہ شعر

لکھا ہے

اجازت ہے تمہارا نام لکھ دوں؟
میرے دل کا ورق سادہ ہے اب تک

وہ لڑکی سمجھدار تھی۔ اس قسم کا آٹوگراف دیکھنے کے بعد اس نے ان شاعر صاحب کے کردار کا اندازہ کر لیا۔ اور ان کے آٹوگراف والے صفحے کو پھاڑتے ہوئے یہ کہا کہ "اس سے بہتر ہے کہ میری آٹوگراف بک کے سارے ورق سادہ ہی رہیں"۔

پچھلے دنوں مجھے ایک بڑی دلچسپ آٹوگراف بک دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں ایک خاص مقصد کے تحت بڑے آدمیوں کے آٹوگراف جمع کیے گئے تھے۔

وہ خاص مقصد یہ تھا کہ ایک بڑے آدمی کے آٹوگراف پر دوسرے بڑے آدمی سے تنقید کرائی جائے، یا بڑے آدمیوں کی ایک دوسرے سے پوشیدہ چشمک کو کسی دن منظرِ عام پر پیش کیا جائے۔ تاکہ اس کے بعد بڑے آدمیوں میں ایک دوسرے کے خلاف رنج، شکوہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہوں تاکہ بقول آٹوگراف بک کے مالک کے "ذرا تفریح رہے"۔ مجھے اس دلچسپ شرارت اور خطرناک تفریح کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے چند صفحات کا مطالعہ یقیناً ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔

اس آٹوگراف بک کے تیسرے صفحے پر ابوالاثر حفیظ جالندھری کا ایک آٹوگراف ہے۔

مصرع سُنا ہے میں نے ایک نیک آدمی سے
عزت کی موت بہتر ذلت کی زندگی سے

حفیظ ۱۳-۴-۴۹ء

اس کے محاذی صفحے پر مجید لاہوری کا ایک جملہ درج ہے۔

"جو مصرع یا نصیحت سنو اس پر خود بھی عمل کرو" مجید لاہوری ۱۲-۸-۴۹ء

پانچویں صفحے پر اُردو کے مشہور افسانہ نگار مہندر ناتھ کا آٹوگراف ہے۔

زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں

مہندر ناتھ

۱۲-۷-۴۶ء

چھٹے صفحے پر ماہر القادری نے لکھا تھا۔

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

ماہر القادری

۲۴-۵-۴۹ء

۲۲ ویں صفحے پر بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔

"اُردو زندہ باد"

عبدالحق

۲۳ ویں صفحے پر بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے جواب دیا۔

"ہندی ہندوستانیوں کی قومی زبان ہے"

پرشوتم داس ٹنڈن

(واضح رہے کہ بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے یہ جملہ اُردو رسم الخط میں لکھا ہے)

۲۸ ویں صفحے پر مشہور ترقی پسند شاعر اسرار الحق مجاز نے لکھا ہے۔

بہ ایں رندی مجاز ایک شاعر مزدور و دہقاں ہے

اگر شہروں میں وہ بدنام ہے بدنام رہنے دے

مجاز

۴۹ ویں صفحے پر کسی فاضل جبلپوری نے طنز کیا ہے۔

"رنڈی اور مزدور دہقان کی شاعری ترقی پسند ادب ہے"!

۵۰ ویں صفحے پر سجاد ظہیر کا آٹو گراف ہے۔

"کھل رہا ہے عہدِ نو کا سُرخ پھُول"

سجاد ظہیر

۵۱ ویں صفحے پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے دستخط ہیں۔

"اسلام اشتراکیت سے ہزار درجہ بہتر نظامِ حیات ہے"!

ابوالاعلیٰ مودودی

۵۹ ویں صفحے پر مشہور اشتراکی ادیب سبطِ حسن نے لکھا ہے۔

زندگی کے جسم پر کوئی سفید بال نہیں

سبطِ حسن

۶۰ صفحے پر کسی سکندر فہیم نے مایوسی کا اظہار کیا ہے۔

زندگی کا کیا بھروسہ ہے

زندگی اک حباب ہے پیارے

۶۲ ویں صفحے پر آٹو گراف بک کے مالک نے اُردو کے مشہور طنز و مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ایک قلمی تصویر یعنی پنسل اسکیچ اُتارا ہے۔ اس پر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے۔

"اس سے تو یہ بہتر ہوتا کہ آپ یہاں اپنی تصویر بناتے اور نیچے میرا نام لکھ دیتے"!

رشید صدیقی

۶۶ ویں صفحے پر مشہور افسانہ نگار ہاجرہ مسرور نے لکھا ہے۔

"جس گھر میں نوجوان لڑکی ہوتی ہے اس گھر کے والدین کو ہوا کے جھونکے سے بھی ڈر لگتا ہے۔"

ہاجرہ مسرور

۶۷ ویں صفحے پر شوکت تھانوی نے ایک بات پیدا کی ہے۔

"مسلمان لڑکیاں شادی کے غم میں بتاشوں کی طرح گھلتی رہتی ہیں۔"

شوکت تھانوی

۷۵ ویں صفحے پر کرشن چندر کی اک تمنا ہے۔

"ہائے وہ لمحہ جو سمٹ کر کائنات بن جائے۔"

کرشن چندر

۷۷ ویں صفحے پر عادل رشید کی بھی ایک تمنا ہے۔

"کاش زندگی کرشن چندر کے افسانے کی طرح خوبصورت ہوتی۔"

عادل رشید

۹۱ ویں صفحے پر سوویٹ روس کے مشہور ادیب ایلیا اہرن برگ نے لکھا ہے۔

"اگر کسی گیدڑ کے سامنے ٹائپ رائٹر رکھ دیا جائے تو وہ بورژوا ادیب کی تحریر لکھ سکتا ہے۔"

ایلیا اہرن برگ

۹۲ ویں صفحے پر سامرسٹ ماہم نے لندن سے بمبئی جاتے ہوئے کراچی کے ہوائی اڈے پر یہ آٹوگراف دیا ہے۔

"ایلیا ایرن سوویٹ ادب کا ڈاکٹر گوئبلز ہے"

سامرسٹ ماہم کراچی ایرپورٹ

اور پھر ان سب آٹوگراف کا شاید بغور مطالعہ کرنے کے بعد آٹوگراف بک کے آخری صفحہ پر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے یہ تبصرہ فرمایا ہے۔

"یہ بیاض ایک ایسا اصطبل ہے جس میں عربی گھوڑے اور خچر ساتھ ساتھ بندھے ہیں"

جوش مرحوم

اور اس تبصرہ کے بالکل نیچے اردو کے ایک شاعر ساغر نظامی نے جوش صاحب پر ہاتھ مارا ہے۔

"اللہ رے بورژوا ایت! زندہ باد شاعرِ انقلاب"

ساغر نظامی

اس پر فراق صاحب نے ایک بڑی زہریلی دستخط ماری

"چور کی داڑھی میں تنکا"

فراق

ان چند صفحات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آٹوگراف بک کا مالک کیسی شرارت پسند فطرت کا مالک ہے۔ میں نے اس آٹوگراف بک سے صرف ان صفحات کو پیش کیا ہے جن میں بڑے اور مشہور آدمیوں بلکہ ادیبوں کی شوخ لیکن بے ضرر قسم کی نوک جھونک ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر کبھی یہ آٹوگراف بک مکمل حالت میں طبع ہو کر شائع ہو جائے تو پھر بلا شبہ عہدِ حاضر کے بہت سے بڑے آدمی ایک دوسرے کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے ہو جائیں۔

اسی آٹوگراف بک کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ابھی ابھی ایک طالب علم کے آٹوگراف بک پر لکھا ہے :-

"ساری دنیا کے بڑے آدمیو! متحد ہو جاؤ اور ڈرو اس ننھی سی کتاب سے جو تم پر ہمیشہ نازل ہونے والی ہے"

عورت کا جغرافیہ

مغربی ملکوں میں عورت کی عمر اور مرد کی آمدنی معلوم کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے یعنی اگر آپ کسی عورت سے پوچھیں ——— "ویل مادام آپ کی عمر کیا ہے؟" تو وہ آپ کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے آپ کو "جنگلی" کہہ دے گی یا پھر اس میز یا محفل سے اُٹھ کر چلی جائے گی جہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے ایک بار اس کا ایک تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ پچھلے سے پچھلے سال مجھے ایک ادبی کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جانا پڑا وہاں اپنی ادبی سرگرمیاں ختم کر لینے کے بعد مجھے یہ سوجھی کہ ذرا یہاں کی غیر ادبی یا بے ادب زندگی کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے سارے وقت کو وہاں کے ہوٹلوں کلبوں، تھیٹروں، سینماؤں، ناچ گھروں، نہانے کے ساحلوں BATHING BEACHS عیاشی کے اڈوں، چوربازاریوں کی زندگی کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا۔ ایک رات میں ایک فحش قسم کے نائٹ کلب میں بیٹھا ایک بالکل برہنہ رقص دیکھ کر اپنی زندگی کا ایک عجیب د

غریب تجربہ حاصل کر رہا تھا کہ ایک پچاس پچپن سالہ بوڑھی میم نوجوان لڑکیوں جیسا میک اپ کئے میرے قریب آئی اور مسکراتے ہوئے اجازت مانگی۔

"کیا میں آپ کے ٹیبل پر بیٹھ سکتی ہوں؟"

میں نے جواب دیا۔

"ضرور۔ کیوں نہیں ———؟"

میں نے سوچا یہ بوڑھی عورت شاید اپنے ماضی کو ڈھونڈنے کے لئے اس نائٹ کلب میں آگئی ہے۔ اگر وہ میرے ٹیبل پر بیٹھ کر اپنے ماضی کا نظارہ کر سکتی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہے؟ وہ میرے ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی اور میں اس سے بالکل انجان سامنے رقص دیکھ رہا تھا تھوڑی دیر بعد۔ اس نے مجھے پھر ایک مخصوص کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ متوجہ کیا اور پوچھا۔

"ویل مسٹر۔ کیا آپ کو عورت کی کمپنی پسند نہیں؟"

میں نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں، ہر مرد کو عورت کی کمپنی پسند ہوتی ہے"

بوڑھی میم نے کہا:۔

"تو پھر میرے یہاں بیٹھنے کے باوجود آپ اس طرح خاموش اور بے تعلق کیوں ہیں؟"

میں نے بوڑھی میم کی طرف اس کی ان جھریوں کی طرف جنہیں غازہ پاؤڈر میں چھپانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مادام ——— آپ دیکھ رہی ہیں کہ اگر میں نوجوان نہیں کم از کم جوان تو ضرور ہوں اور یہ بالکل فطری تقاضہ ہے کہ نوجوان مرد

یا نوجوان عورت، نوجوان عورت اور مرد ہی کی کمپنی پسند کرتے ہیں۔"
میرے اس جواب سے معاً اُس کی پیشانی پر تیوریاں پھیل گئیں اور اس نے قدرے غصّے سے پوچھا۔
"تو تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ تمہارے خیال میں میری عمر کیا ہو گی؟"
میں نے بہ کمال سادہ لوحی جواب دیا۔
"یہی ہو گی کوئی پچاس پچپن سال!"
میرا یہ جواب سُنتے ہی وہ جیسے آگ بگولا ہو گئی۔ اس کا سارا چہرہ سُرخ ہو گیا اور وہ غصّہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی۔
"ڈیم فول ــــ تم ہندوستانی لوگ بڑا جنگلی ہوتا ہے۔"
مجھے بھی بڑا غصّہ آیا لیکن میرے اِرد گرد سارے انگریز لوگ تھے۔ میں تنہا تھا اور میری حریف ایک بڑھیا تھی۔ اس لئے میں غصّہ پی گیا لیکن مجھے بڑا دکھ تھا کہ ایک بڑھیا خود ہی میرے قریب آئی خود ہی مجھ سے مخاطب ہوئی اور میری سادہ و معصوم راست گوئی پر اس طرح برہم ہو کر اور خواہ مخواہ گالی دے کر چلی گئی۔ "ڈیم فول"۔
دوسرے دن صبح میں نے اس واقعہ کا تذکرہ اپنے ایک پاکستانی دوست سے کیا جو لندن میں امپورٹ اکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے تو اُس نے گلا پھاڑ کر ہنستے ہوئے کہا۔
"میاں برخوردار ــــ تم نہیں جانتے۔ یہ مغرب ہے مغرب۔ یہاں کی کسی عورت سے اس کی عمر نہیں پوچھنا یا اگر کوئی عورت تم سے اصرار کر کے بھی اپنی عمر کے بارے میں پوچھے تو چاہے وہ پچاس کی کیوں نہ ہو تم بغیر دروغ گوئی کے گناہ کے احساس کے اس سے کہہ دو کہ تمہاری عمر ۲۵ یا تیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ ورنہ تم بڑے بدتمیز قرار دیئے جاؤ گے۔"

میں نے اس کی نصیحت شکریہ کے ساتھ قبول کی اور آئندہ سے احتیاط کا وعدہ کیا۔ اور اس سے رخصت ہوا۔ پھر تھوڑے دن گذر گئے۔ مجھے اپنے ایک ہندوستانی دوست کے ساتھ ایک انگریز نوجوان لڑکی کی سالگرہ میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ انگریز نے جس وقت اپنی لڑکی کا میرے ساتھ تعارف کرایا تو میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کی عمر پچیس سال سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ غالباً وہ شادی شدہ بھی تھی۔ کیونکہ اس نے ایک پانچ سالہ ننھی بچی کو بھی گود میں اٹھا رکھا تھا۔ انگریز نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ میری لڑکی ہے سوسی گرے، اور آج اس کی اٹھارویں سالگرہ ہے۔"

میں نے مبارکباد دینے کے بعد اپنے ہندوستانی دوست کے کان میں سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"یار۔ اگر اس کی ۲۵ سالہ لڑکی کی یہ اٹھارہویں سالگرہ ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ پانچ سالہ لڑکی جو اس کی گود میں ہے ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی ہے۔"

میرے ہندوستانی دوست نے مسکرا کر مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ میں خاموش رہا۔ اور یوں بھی ہمیشہ مجھے خاموش بلکہ مبہوت اور متحیر رہنا چاہیئے۔

میں اس شاعرانہ تعلّی کو بڑی حد تک تسلیم کرتا ہوں کہ عورت بہ حیثیت مجموعی ہمیشہ جوان رہتی ہے۔ وہ کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ بوڑھی ہونے کے باوجود بھی جوان رہتی ہے یا جوان رہنے یا نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ دنیا کا ہر مرد بھی کم و بیش یہی چاہتا ہے کہ عورت کبھی بوڑھی نہ ہو۔ سدا جوان رہے لیکن مغرب کی یہ حماقت ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہاں عورت چھوٹی عمر کا سہارا لے کر کیوں جوان رہنا چاہتی ہے اور اس طرح چھوٹی عمر کب تک اُسے جوان رکھ سکتی ہے۔ مغرب کی عورت مجھے جنگلی سمجھے یا ڈیم فول کہہ دے۔ مجھے جنگلی کہلانا

اعزاز اور انگریزی گالی دونوں منظور ہیں لیکن مغرب کی عورت کی یہ حماقت کبھی نہیں۔

اس سے تو ہمارے غریب ملک کی عورت ہزار درجہ راستباز اور سادہ و معصوم ہے آپ کسی گھرانے میں چلے جایئے۔ آپ عورتوں کو ہمیشہ اپنی یا دوسری عورت یا عورتوں کی عمر پر باتیں کرتے ہوئے سُنیئے گا۔ یعنی۔

بہن۔ــــــ اس رمضان کی عید پر میری جمیلہ پورے سترہ برس کی ہوتی ہے ــــــ یا

اماں جی خالدہ کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھو گی اس شب برات کو اس کی عمر ۲۲ برس ہو جائے گی۔ جوان لڑکی کو اس طرح گھر میں نہیں بٹھائے رکھنا چاہیئے ــــــ یا۔

آپا جان ــــــ سفید بال کیوں نہ نکلیں ۳۳ واں ختم ہوا ہے اور ۳۴ واں چل رہا ہے۔ اب تو اپنا چل چلاؤ ہے۔

ممکن ہے کہ ہمارے یہاں کبھی کبھار عورت کی عمر مصلحتاً چھپائی جاتی ہو۔ مثلاً کسی لڑکی کی شادی کسی وجہ سے عرصہ دراز سے نہ ہو سکی ہو یا زیادہ عمر ہو جانے کے باعث اس کے رشتے ٹوٹ جاتے ہوں تو اس کے والدین اور رشتہ دار اس کی اصل عمر چھپا کر اور گھٹا کر بیان کرتے ہوں کہ۔

"صحت مند ہونے کی وجہ سے شاہدہ ۲۵ سال کی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل اس کی عمر ۱۹ سال سے زیادہ نہیں ہے"

تو گویا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں عورت کی عمر اور مرد کی آمدنی کے بارے میں صحیح صحیح معلومات فراہم کرنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ یہ ایک عام سی بات ہے کہ

شادی بیاہ کے موقعوں پر ان باتوں کا پوری سچائی کے ساتھ اظہار کیا جاتا ہے۔ مثلاً

"نجمہ کی عمر ۲۰ سال ہے لیکن یہ بتاؤ کہ لڑکے کی آمدنی کیا ہے؟

اس کی آمدنی کم از کم تین سو روپے ماہوار ہو تو پھر بات چیت بھی کی

جائے۔ کیوں ٹھیک ہے نا بُرا؟"

مغرب میں عورت کی عمر اور مرد کی آمدنی کے بارے میں پوچھنا معیوب سہی لیکن ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق نہیں ہے۔ البتہ ہمارے ملک میں اس کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ عورت کی عمر اور مرد کی آمدنی کو ایک دوسرے سے کسی طرح بھی جدا نہیں کیا جا سکتا جس مرد کی آمدنی جتنی زیادہ ہو اس کی عورت کی عمر اتنی ہی کم ہو گی چاہے مرد کی عمر صرف ۱۵ سال ہو لیکن اس کی آمدنی ماہانہ دو ہزار روپے ہو تو اس کی عورت کی عمر صرف ۱۵ سال ہو گی۔ اس کے برعکس اگر مرد کی آمدنی ۱۰۰ روپے ماہوار ہو اور اس کی عمر ۲۵ سال ہو تو اس کو ۳۰۔۳۲ سال کی عورت کو بھی اپنی بیوی بنانے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔

بہر حال ہمارا ملک تو سیدھے سادھے لوگوں کا ملک ہے۔ ہمارے پاس نہ تو جھوٹی شان شوکت ہے نہ ریاکاری۔ ہمارے ملک میں ۲ + ۲ = ۴ ہوتے ہیں ۵ کبھی نہیں ہوتے یہ تو مغرب ہی ہے جہاں نہ صرف دو جمع دو پانچ ہوتے ہیں۔ بلکہ عین آپ کی نظروں کے سامنے ۵۵ میں سے ۳۵ کو منفی کر کے ایک بڑھیا کو جوان بنا دیا جاتا ہے۔ ورنہ پھر مان لیجئے کہ آپ "ڈیم فول" ہیں۔

برطانیہ کے علاوہ مجھے بعض اور مغربی ممالک بالخصوص فرانس کے باشندوں کی عادات و خصائل کے مطالعہ کا موقع ملا ہے اور میں نے یہ معلوم کیا ہے کہ یہ لوگ دنیا میں سب سے زیادہ دلچسپی جس چیز میں لیتے ہیں وہ ہے عورت کی عمر ——— حتیٰ کہ

مغربی ممالک میں عورت کا ایک جغرافیہ تک مرتب کیا گیا ہے۔ میں نے جب عورت کا جغرافیہ سنا تھا تو حیران ہو کر رہ گیا تھا۔ میں ایک بار ہانگ کانگ سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی لوٹ رہا تھا میری ساتھ والی نشست پر ایک بڑا باتونی اور بکواسی انگریز بیٹھا ہوا تھا۔ جو بے تحاشا شراب پی رہا تھا اور بے تحاشا بکواس کئے جا رہا تھا۔ میں اس کی شراب خوری اور بکواس دونوں سے عاجز آ کر کھڑکی سے جھانک کر نیچے سمندر اور زمین اور ابر کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے مجھے جھنجھوڑ کر پوچھا:۔

"یہ نیچے کیا دیکھ رہے ہو۔ نیچے کیا ہے؟"

میں نے کہا:۔

"مجھے جغرافیہ سے بڑی دلچسپی ہے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے نیچے کسی نے بہت بڑا اٹلس بچھا رکھا ہے۔"

اس نے نشے میں بہکتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن کیا تم نے عورت کا جغرافیہ بھی پڑھا ہے؟"

میں نے ٹالنے کے لئے مختصراً جواب دیا۔

"نہیں۔"

تو وہ اپنی سیٹ پر اچھل پڑا اور بولا۔

"تو پھر تم کیسے نوجوان ہو؟ لو میں تمہیں سناتا ہوں۔"

۶ اور ۱۲ سال کے درمیان عورت براعظم آسٹریلیا ہے جو پسماندہ ہے لیکن آہستہ آہستہ ترقی کر رہا ہے۔

۱۲ اور ۱۵ سال کے درمیان عورت براعظم افریقہ ہے۔ بہت گرم اور آدھا دریافت شدہ

اور آدھا زیر دریافت ۔

۱۵ اور ۲۵ سال کے درمیان عورت براعظم ایشیا ہے ۔ گرم اور نرم ۔ غلامی اور سپردگی کے لئے آمادہ ۔

Exchange & Interchange

۲۵ اور ۳۵ سال کے درمیان عورت براعظم امریکہ ہے ۔ رنگین، فیشن ایبل، خوبصورت حسن و جوانی کی دولتوں سے مالا مال ۔

۳۵ اور ۵۰ سال کے درمیان عورت براعظم یورپ ہے ۔ بعض بعض مقامات پر دلچسپ ہے بعض بعض مقامات پر غیر دلچسپ ۔

۵۰ سال کے اوپر عورت سوویٹ روس ہے جس کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ وہ کہاں واقع ہے لیکن وہاں کوئی نہیں جاتا ۔

عورت کا یہ دلچسپ جغرافیہ سن کر مجھے لطف تو آیا لیکن مجھے مغرب کے ان شاطروں کی اس ذہنیت پر بڑا غصہ آیا کہ یہ جب عورت کا یا عورت کی عمر کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ تو کیا سیاسی ذہن رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس کا یہ کہنا ۱۵ سے ۲۵ سال کے درمیان براعظم ایشیا ہے جو غلامی اور سپردگی کے لئے آمادہ رہتی ہے ۔ یہ مغرب کی بیہودہ برتری کی یک کمینہ مثال ہے ۔ میں اس شرابی اور بکواسی انگریز کو اس وقت اس کا مزہ چکھاتا ۔ لیکن وہ بقول اس کے اپنی "بے بی" سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا تھا اور اس بے بی کی عمر ہو گی کوئی ۳۰ اور ۳۵ کے درمیان ۔

مغرب کے بعض ڈاکٹروں کا یہ کہنا ہے کہ وہاں عورت کی عمر دانستہ اس لئے کم بتائی جاتی ہے کہ اس کا عورت پر نفسیاتی اثر بہت اچھا پڑتا ہے اور وہ زیادہ عمر کی ہونے کے باوجود کم عمر دکھائی دیتی ہے اور اس طرح عورت کی جوانی دنیا کی جوانی کو نکھار نے

میں مدد دیتی ہے اور دنیا کے رہنے بسنے کے لئے ایک دلچسپ اور رنگین جگہ بن جاتی ہے۔

اگر ہم مغرب کی ایک چالیس سالہ عورت کا اپنے وطن کی بیس سالہ عورت سے مقابلہ کریں یا دونوں کو ساتھ ساتھ کھڑا کر کے فوٹو کھنچوائیں تو دیکھنے میں اپنے وطن کی بیس سالہ عورت مغرب کی چالیس سالہ عورت سے زیادہ عمر اور بوڑھی معلوم ہوگی۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ مغرب میں عورت کی کم عمر بتلانے کا رواج ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی وجہ آزادی اور ملک کی اقتصادی خوش حالی ہے۔

"عورت کی عمر کا اس قوم کی سیاسی آزادی اور اقتصادی حالت سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔"

مغرب میں عورت کو بڑی حد تک مرد کی روایتی غلامی سے آزاد کر دیا گیا ہے اس جہالت کے جہنم سے نکال کر انسانوں کی دنیا میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کو اتنی خطرناک حد تک آزادی دے دی گئی ہے۔ کہ وہ ہر سال بالکل عریاں ہو کر لانگ بیچ کلیفورنیا میں لاکھوں مردوں کی موجودگی میں آتی ہے اور "حسینۂ عالم" کا خطاب حاصل کر کے دنیائے خوبصورتی کی حکمرانی کا تاج پہنتی ہے۔ وہ ہر جگہ مرد کے دوش بدوش رہتی ہے۔ آج مغرب میں صرف مردوں کا کرنے والا کونسا ایسا کام ہے جو عورتیں نہیں کرتیں۔ موٹر اور سائیکل چلانا توکجا عورت ہوائی جہاز تک اُڑاتی ہے۔ اور تازہ ترین اخباری اطلاعات کے بموجب عورتوں کی ایک جماعت کوہستان ہمالہ کی ایک چوٹی "گاڈون آسٹن" کو فتح کرنے نکل پڑی ہے اور اس طرح اس نے اس مقولے باز کے منہ پر ایک طمانچہ لگایا ہے جس نے فخر سے کہا تھا ـــــ "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے!"

ہمارے ملک میں ایک عام عقیدہ ہے کہ عورت کا مقام اس کے مرد کا گھر

ہے، چنانچہ ہم یہاں سوئی دھاگہ چولھا اور جھولا کے بغیر عورت کا تصوّر کر ہی نہیں سکتے لیکن مغربی ممالک میں سوئی دھاگہ، چولھا اور جھولا مرد کے لئے ہیں اور عورت صرف اپنے جسم کی نمائش اور اپنی اصلی عمر کو گھٹانے کے مظاہروں میں مصروف ہے۔ آپ مغرب کے کسی ہوٹل میں چلے جایئے آپ کو جتنے باورچی اور (CHEFF) ملیں گے وہ سب کے سب مرد ہیں یا آپ کو جتنے درزی ملیں گے وہ سب مرد ہیں۔ اور بچّوں کو جھولے میں سلانے اور تفریح گاڑی میں گھمانے والے سب مرد ملیں گے۔ آپ نے اپنے وطن کی سڑکوں پر بھی مغرب کی عورتوں اور مردوں کو دیکھا ہوگا۔ شام کے وقت کوئی صاحب اولاد فرنگی جوڑا ہمارے شہر کی سڑک پر نظر آتا ہے تو اس طرح نظر آتا ہے۔

شوہر بچہ گاڑی دھکیلتا جا رہا ہے اور عورت سگریٹ کا دھواں اڑاتی ساتھ چلی جا رہی ہے۔

مغرب کی عورت کی زندگی ایک بے فکر زندگی ہے۔ اسے زندگی گذارنے کے لئے مشرق کی عورت کی طرح کوئی مصیبتیں نہیں سہنی پڑتیں۔ اس کے لئے زندگی ناچ گھر کا چمکیلا فرش ہے جہاں وہ صرف ناچتی اور گاتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں بھی وہ بیس سال کی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے وطن کی ۲۰ سالہ دوشیزہ جو اپنے پانچ بچوں کے درمیان مرغی کی طرح گھری بیٹھی برتن مانجھ رہی ہے یا پورے گھر کا جھاڑو لگا رہی ہے۔ چولھے میں آگ پھونک رہی ہے یا پھٹے ہوئے لحاف میں ٹانکے مار رہی ہے یا پھر اپنے بیمار شوہر کے پاؤں داب رہی ہے یا پھر اس سوچ میں غرق ہے کہ بچّوں کو دودھ پلانے کے لئے یا گھر بار کا پیٹ بھرنے کے لئے کہاں سے پیسہ لائے۔ وہ بھلا بیس سال جیسی شگفتہ عمر میں کس طرح نہ مرجھائے۔ اقتصادی بدحالی ہماری عورت سے عین عالم جوانی

میں اس کی جوانی لوٹ لیتی ہے۔ اور اُس کی اُمیدوں کے دِن اور مرادوں کی راتیں
چھین لیتی ہے۔

عورت کی عمر بذاتِ خود کوئی چیز نہیں سب سے بڑی چیز عورت کی
اقتصادی حالت ہوتی ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مشرق کی عورت کی ایک ضخیم اور دردناک تاریخ
تو ضرور موجود ہے لیکن جغرافیہ کوئی نہیں ؛

حرام خوری

میرے سو پشت سے پیشۂ آبا، پچھتر پشت سپہ گری اور پچیس پشت انشا پردازی رہا ہے لیکن نہ جانے کہاں کیا کسر رہ گئی کہ میری طبیعت نہ سپہ گری کی طرف جاتی ہے، اور نہ انشا پردازی کی طرف مائل ہوتی ہے جی صرف یہ چاہتا ہے کہ آٹھوں پہر فرصت کے رات دن ملیں اور آسمان سے دن کو ہُن اور رات کو بادۂ گلفام برسا کرے۔

میرے بزرگ اور میرے دشمن میری اس افتادِ طبع کو حرام خوری پر محمول کرتے ہیں صرف اس لئے نہیں کہ بادۂ گلفام مذہباً حرام ہے بلکہ اس لئے کہ میں "برکت بغیر حرکت" کا متمنی ہوں۔ لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں جبکہ میں اس زمانے کا انسان ہوں جو سرمایہ داری کا زمانہ ہے اور حرام خوری سرمایہ دارانہ عہد کی واحد معاش ہے۔ اب چاہے اُسے نیک معاش کہا جائے۔ یا بد معاش تصور کیا جائے۔

اپنی اس افتادِ طبع کے مطابق جب میں عرصۂ دراز تک گھر کی مفت روٹیاں توڑتا

اور کھاتا رہا تو ایک دن گھر کے سارے بزرگ بہ اَستثنیٰ والدہ مجھ پر بڑے برافروختہ ہوئے
"تمہیں شرم نہیں آتی۔ ہٹے کٹے ڈانڈگے مسٹنڈے جوان ——————
ہو اور کوئی کام کاج نہیں کرتے۔ ہم بوڑھوں کی کمائی کھاتے ہو حالانکہ اس عمر میں تو
تمہیں ہمارا اعصائے پیری بننا چاہیئے"

یہ پھٹکار تو مجھ پر یوں پڑی جیسے چکنے گھڑے پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ میں نے
ایک لمبی جمائی لی انگڑائی توڑی اور مسکرا کر چُپ ہو گیا۔

لیکن میرے بزرگ چُپ نہیں ہوئے بلکہ میری اس اداکاری پر اور زیادہ برافروختہ
ہوئے اور صاف صاف کہہ دیا۔

"آج سے اس گھر میں تمہارا کھانا پینا بند —————— اپنا کماؤ اور
اپنا کھاؤ — بلکہ یہ گھر بھی آج ابھی اسی وقت چھوڑ دو"

یہ سُننا تھا کہ برسوں کی سوئی ہوئی غیرت اچانک جاگ پڑی اور بولی۔

"ہیں یہ کیا؟ تو میرے سونے کے دوران میں نوبت یہاں پہنچ گئی۔
خیر کوئی پرواہ نہیں۔ آؤ میرے ہمراہ آؤ اور تمہیں خدا کی قسم یہ گھر
آج ابھی اسی وقت چھوڑ دو"

میں ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ کچھ کچھ ملتجیانہ نگاہوں سے اپنے بزرگوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ خدارا وہ اپنے فیصلہ پر ایک بار نظرِ ثانی کریں۔ لیکن یہ کم بخت غصیلی غیرت میری بانہہ پکڑ کر کشاں کشاں گھر سے باہر لے گئی۔ اس پر والدہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے نوجوانوں نے بغلیں بجائیں اور بوڑھوں نے فرش پر بلغمی پیک غصے سے تھوک دی۔ بات آئی گئی ہو گئی اور میں خانماں برباد ہو گیا۔

خانماں برباد ہونے کے بعد پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ زندگی کا راستہ کتنا دشوار گذار ہوتا ہے اور میرے نصب العین کے کتنے منافی۔ میں برکت بغیر حرکت کا قائل ہوں، اور زندگی ہر لمحہ ہاتھ پاؤں چلاتے رہنے کی خوگر۔ لیکن میں نے تہیہ کر لیا کہ چاہے جان چلی جائے میں نہ اپنی وضع بدلوں گا اور نہ نصب العین۔ انسان تو وضع اور نصب العین کے لئے جان سی عزیز شے قربان کر دیتا ہے۔

دن بھر گھومنے پھرنے کے بعد تھک کر اور بھوک سے بدحال ہو کر میں گاندھی گارڈن کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔؟ اب تو غیرت بھی جس نے مجھے گھر سے نکالا پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے؟ اب مجھے خیال آیا جان پر نصب العین کو قربان کرنا چاہیئے یا نصب العین پر جان کو۔!

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی بنچ پر جس پر میں بیٹھا ہوا تھا ایک اور آدمی آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک بغور میری طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

"جوان! تم بہت اُداس اور پریشان معلوم ہوتے ہو؟ کیا بات ہے؟ کچھ بتاؤ۔ میرے لائق کوئی خدمت؟"

میں نے جواب دیا۔

"میرے پیارے اجنبی! میں فی الحال تمہارے لائق صرف ایک ہی خدمت سپرد کر سکتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ بھوک سے بدحال ہوں مجھے کھانا کھلاؤ!"

پیارا اجنبی فوراً بولا۔

"اوہ بس اتنی سی بات! آؤ میرے ساتھ ہوٹل چلو!"

میں ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا کہ کہیں پیارا اجنبی ارادہ نہ بدل دے یا پھر اُسے اپنی دعوت پر نظر ثانی کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ ہوٹل میں طعام کے دوران میں پیارے اجنبی نے پوچھا۔

"جوان — کیا تم بے روزگار ہو، تعلیم کہاں تک ہے تمہاری؟ کیا تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے؟ تم بے روزگار کیوں ہو؟ کیا تم نے کبھی کوئی روزگار تلاش کرنے کی کوشش کی؟"

میں نے جواب دیا۔

"پیارے اجنبی! میں صرف تین سوالات کا جواب دینے کا قائل ہوں شاید تم نہیں جانتے کہ میں کسی فلمی رسالے کے "سوال وجواب" قسم کا انسان واقع ہوا ہوں۔"

پیارے اجنبی نے کہا۔

"اچھا جوان۔ تو پھر تم پہلے تین سوالات کا جواب دو۔"

میں نے حافظے پر بڑا زور ڈال کر اُس کے پہلے تین سوالات یاد کئے اور علی الترتیب حسب ذیل جوابات دیئے جو بالکل صحیح تھے۔

(ا) ہاں میں بے روزگار ہوں۔

(ب) بی اے تک تعلیم پائی ہے۔

(ج) کنوارا ہوں۔

آخری سوال کے آخری جواب پر تو پیارا اجنبی اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور بولا۔

"اماں واللہ! سچ مچ کنوارے ہو؟"

میں نے کھانے کا آخری آئیٹم یعنی فیرنی کھاتے ہوئے سر ہلایا اور بولا :-

"صد فی صد کنوارا"

پیارے اجنبی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور مجھے کنوارا اور اس پر فیرنی کھاتا دیکھ کر اس کے منہ سے ہلکی سی رال ٹپک پڑی اور میری بات پر یقین کر لینے کے باوجود "یقینِ مزید" کے لئے اس نے کہا۔

"اماں نہیں جھوٹ بہکاتے ہو"

میں نے کھانا کھا لیا تھا اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا اس لئے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے اور ہوٹل سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

"اماں چلو یہی سہی۔ جھوٹ ہی بہکا رہا ہوں"

پیارا اجنبی میرے پیچھے دوڑا۔ اور پکارا۔

"اماں جوان! واللہ یار تم تو بڑے غضب کے جوان ہو۔ کہاں جا رہے ہو۔ تم بی اے پاس ہو وجیہہ و شکیل نوجوان ہو اور اس طرح بھاگے جا رہے ہو"

میں نے پوچھا۔

"کیوں؟ کیا بی اے پاس اور وجیہہ و شکیل بھاگ نہیں سکتا؟ اماں واللہ خدا قسم تمہیں بھاگ کر دکھاؤں کہ کیسا بھاگتا ہوں؟"

پیارا اجنبی پریشان ہو گیا اور میری بانہہ مضبوطی سے پکڑ کر مجھ سے بولا۔

"نہیں جوان نہیں۔ یہ غضب نہ کرو۔ میں تو تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے تمہاری ہی تلاش تھی آج سے زندگی بھر کے لئے تم میرے مہمان ہو

میرے گھر چلو۔ میں بڑا دولت مند آدمی ہوں۔ تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں اُٹھانی پڑے گی۔"

میں خانماں برباد تو تھا ہی فوراً آمادہ ہو گیا۔ اس کے گھر پہنچا۔ بڑا ہی شاندار بہترین سجا سجایا گھر تھا۔ اس نے مجھے آرام دہ فرنیچر سے آراستہ کمرہ دکھا کر کہا۔

"آج سے یہ کمرہ تمہارا"۔

میں نے اس کا پُر خلوص شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن پیارے اجنبی! بڑی عجیب بات یہ ہے کہ تمہارا ہمارا اب تک کوئی تعارف نہیں ہوا تم کون ہو اور مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو؟"

پیارا اجنبی بولا۔

"میں ایک سرمایہ دار ہوں۔ باپ دادا نے بڑی حرام کی دولت چھوڑی تھی اس کا یکہ و تنہا وارث ہوں۔ نہ شادی کی اور نہ کوئی اولاد ہوئی اب تم سے کیا پردہ میں حرکت بغیر برکت کا قائل ہوں۔"

یہ سُننا ہی تھا کہ میں فرطِ مسرت سے ایک دم اس کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا:-

"بس بس۔ اب تعارف کے تکلف کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کتنا عظیم ہے۔ اس نے مجھے کس طرح اپنے ہم خیال اور ہم نصب العین شخص سے ملایا ہے لیکن پیارے اجنبی۔ تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم مجھ پر کیوں مہربان ہوئے کیا تم مجھے اپنا متبنیٰ بنانا چاہتے ہو یا پھر......؟"

پیارے اجنبی نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔

"جوان۔ میں تم پر اس لئے مہربان ہوا کہ میں ایک ماموں ہوں۔"

میں بڑا حیران ہوا اور پوچھا۔

"ماموں! بھلا یہ کیا جواب ہوا؟"

پیارے اجنبی نے دوسری لمبی ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔

"ہاں جوان۔ میں اپنی اکلوتی اور کروڑپتی بھانجی کا ماموں ہوں اور میں تم پر اس لئے مہربان ہوا تم بی اے پاس، خوب صورت اور وجیہہ اور شکیل ہو۔ اور میں جانتا ہوں کہ میری اکلوتی بھانجی کا بیاہ کسی ایسے ہی تعلیم یافتہ جوان سے کروں۔ خوشی کی بات یہ ہے تمہارا ابھی وہی نصب العین ہے جو میرا ہے۔ اگر تم اس سے شادی کر لو تو پھر حرکت بغیر برکت ہی برکت ہوگی۔ کہو بیاہ منظور ہے؟"

میں نے جواب دیا۔

"منظور ایک دم منظور"۔

پیارے اجنبی نے کہا:۔

"دیکھو سوچ سمجھ کر جواب دو یہ شادی بیاہ کا معاملہ ہے"۔

میں نے کہا:۔

"پیارے اجنبی تم بالکل فکر نہ کرو تم نہیں جانتے کہ میں اس ملک کا باشندہ ہوں جہاں معمولی چیزیں مثلاً گوشت ترکاری خریدتے وقت بھی کافی سوچ بچار کیا جاتا ہے لیکن صرف ایک مسئلہ ایسا ہے شادی، جس پر شادی کرنے والے کبھی نہیں سوچتے۔ بلکہ شادی کرانے والے سوچا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ مسئلہ میرے سوچنے کا نہیں۔ چونکہ تم شادی

کرا رہے ہو اس لئے تمہیں سوچنا چاہیئے یہ تمہارا کام ہے۔ میں اس میں کس طرح مداخلت کروں؟ تم تو خیر ازلی کنوارے ہو لیکن اپنے باپ کے بارے میں تو جانتے ہوگے کیا انہوں نے تمہاری والدہ سے شادی کرتے وقت......

پیارے اجنبی نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"بس بس اب آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں جوان! تم بڑے برخوردار اور سعادت اطوار ہو۔ لیکن میں صرف یہ چاہتا تھا۔ کہ تم اگر شادی سے پہلے ایک نظر میری بھانجی کو دیکھ لیتے تو اچھا تھا۔ تاکہ کل کو کہیں تمہیں شکایت نہ رہ جائے کہ تمہاری بیوی کالی بدوضع ......"

جواباً میں نے پیارے اجنبی کے منہ پر ہاتھ رکھا اور بولا:۔

"بس بس۔ اب آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے نصب العین کی خاطر کسی لنگوری سے بھی شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ آخر نصب العین کی خاطر انسان جان تک دے دیتا ہے۔ اس وقت بات ختم کرو۔ زیادہ کھانے...... اور زیادہ خوشی کے باعث مجھے بڑی سخت نیند آرہی ہے۔ شب بخیر"

اس کے بعد ایک نہایت شاندار اسپرنگ دار مخملیں پلنگ پر لیٹ گیا جو پلنگ کم اور سعادت حسن منٹو کا افسانہ زیادہ تھا۔

چوتھے دن میری شادی خانہ آبادی ماموں کی بھانجی سے ہوگئی۔ ماموں کی مانجھی کو دیکھ

کر مجھے پھر تو اُبکائی آئی۔ لیکن اس خیال سے کہ پبلک میں قے کرنا بڑی معیوب حرکت ہے میں نے غسلخانے میں جاکر قے کی۔ جن لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں نے قے کر دی انہوں نے پوچھا۔ "بھئی تم نے قے کیوں کی؟"

میں نے جواب دیا :-

"ایک ٹیڑ بکس کی طرح ٹھنگنی دبلی پتلی، کالی بھجنگ، چیچک رُو، بوم چشم جاہل مطلق اور گنوار عورت (بلکہ عورت کے بجائے عورت کی مذمت) کو دیکھ کر میں قے نہ کرتا تو کیا کرتا؟ تم لوگ ہی بتاؤ کہ ایسی صورت حال ہو تو قے کا کیا نعم البدل ہے؟"

یار لوگ قے کا نعم البدل نہ بتا سکے۔ خواہ مخواہ خفیف ہوئے ویسے میں نے خود بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ محسوس کیا کہ اس شادی اور قے کرنے میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے لیکن بھئی نصب العین کے لئے اگر قے کرنا پڑے تو کیا حرج ہے جبکہ انسان نصب العین کے لئے جان تک دے دیتا ہے۔

میری اس سپھنیہ نما شادی کی اطلاع جب میرے بزرگوں اور دشمنوں کو ملی تو وہ بڑے ناراض ہوئے اور دوستوں نے بڑا افسوس کیا لیکن میں اپنی جگہ مطمئن اور مسرور تھا کیونکہ نصب العین ......

شادی کے بعد میں دن بھر نرم نرم گدیلوں پر پڑا اینڈنے لگا دن عید تھے اور راتیں شب برائیں نہ تھیں پھر بھی نزہت کے رات دن تھے۔ دن کو آسمان سے دن اور رات کو بادۂ گلفام برسا کرتا تھا۔

شادی کو کچھ عرصہ گذر گیا تو میرے حاسد اور دشمن مجھ پر انگلیاں اٹھانے لگے۔

اور میرے خلاف زبان خلق کا نقارہ زور زور سے بجنے لگا کہ دیکھو یہ سنڈا مسٹنڈا کوئی کام نہیں کرتا۔ بیوی کے روپے پر پلتا ہے مرد کے لئے یہ کتنی شرم کی بات ہے! توبہ توبہ! میں نے انگلیاں اٹھاتے ہوئے حاسد دشمنوں اور زبان خلق کو سمجھانا چاہا کہ کم بختو! یہ سرمایہ داری کا دور ہے یعنی تجارت کا دور۔ میں نے اپنے خوبصورت چہرے، قوی ہیکل جسم اور اپنی بی اے کی ڈگری کو بیچ کر یہ روپیہ حاصل کیا ہے تو گناہ کیا کیا ہے؟ صرف تجارت ہی تو کی ہے! لیکن مردانگی کا اوٹ پٹانگ نظریہ رکھنے والے اُلّو کے پٹھوں کے سمجھ میں بات ہی نہیں آئی۔ انہوں نے صاف صاف تہمت لگادی کہ یہ ہمارا پیارا مرد نہیں ہے۔ میں نے پرواہ نہیں کی لیکن ایک دن بیوی نے بھی یہی کہا کہ اس کی سہیلیاں کہتی ہیں کہ جو میاں کماؤ ہوتا ہے وہی مرد ہوتا ہے اس لئے تم بھی ذرا مردانگی کے جوہر دکھاؤ تو پہلے میں سوچ میں پڑ گیا۔ اور پھر یہ طے کیا کہ بد اچھا بدنام بُرا۔ چلو ذرا مردانگی سے کچھ کما کر بھی دکھالیں۔ حالانکہ سب سے بڑی مردانگی کا جوہر یا مردانگی کا سب سے بڑا جوہر تو میں دکھا چکا ہوں۔ یعنی لیٹر بکس جتنی ٹھنگنی، بجلی کے تار جتنی دُبلی پتلی، کالی چمرخ، بوم چشم چیچک رُو جاہل اور اُجڈ عورت سے شادی کر لی، کیا یہ مردانگی نہیں؟ خیر پھر بھی چلو! اس میدان میں یعنی کمانے کے میدان میں بھی دو ہاتھ دکھالیں۔

بڑی سوچ بچار کے بعد پتہ چلا کہ میں سوائے بزنس کے اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔ چونکہ فطرتاً جدت پسند واقع ہوا ہوں۔ اس لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ایسا بزنس کروں گا جو بالکل نرالا ہو جس کو دیکھ کر لوگ حیران ہو جائیں گے، ایسا بزنس پہلے بھی میں کر چکا ہوں یعنی روپے کے لئے شادی کی اور اب اسی نوع کے مختلف بزنس۔ چنانچہ دوسرے ہی دن بیوی سے روپے لے کر میں توڑ جوڑ یا بازار گیا۔ دس ہزار پگڑی پر

ایک دوکان کرائے پر لی۔ اور ایک بہت بڑا سائن بورڈ لکھوا کر دوکان پر لگوالیا۔

> آپ کی طرف سے آپ کے کاموں کیلئے دنیا کا سفر کرنے والے
>
> حاجی ابراہیم حاجی جلیس اینڈ سنز
>
> توڑ جوڑیا بازار۔ کراچی
>
> ٹیلیفون ۴۲۰ ——— تار کا پتہ: ہولڈ ان
>
> ہمارا ٹریڈ مارک ناشتہ دان

پانچویں دن جیسے ہی میں دوکان میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ دو آدمی بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے پوچھا:۔

آدمی:۔ معاف کیجئے حاجی ابراہیم حاجی جلیس آپ ہی کا اسم گرامی ہے؟

میں:۔ معاف کردیا۔ ہاں میں ہی حاجی ابراہیم حاجی جلیس ہوں۔ فرمایئے آپ کو کیا کام ہے؟

آدمی:۔ ہم نے آپ کا سائن بورڈ پڑھا لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کس قسم کا بزنس کرتے ہیں یہ "آپ کی طرف سے آپ کے کاموں کے لئے دنیا کا سفر کرنے" کا کیا مطلب ہے؟"

میں:۔ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ فرض کیجئے آپ کو لاہور میں کام ہے اور آپ یہاں اتنے مصروف ہیں کہ آپ بذاتِ خود نہیں جاسکتے تو آپ ہماری فرم کو لاہور آنے جانے کا کرایہ دے دیجئے اور اوپر پچاس روپے ہمارا کمیشن علاوہ

قیام و طعام کے انتظام کے ہم آپ کا کام کر آئیں گے۔

آدمی:۔ خوب خوب۔ یہ تو بالکل نرالی فرم ہے۔ اسے کہتے ہیں تجارت کی ترقی۔ اچھا جب تو میرا ایک کام یہ ہے کہ میرے بھائی کی ایک چار سالہ بچی ہے۔ جو میرے پاس ہے، لیکن میرے بھائی صاحب راولپنڈی میں رہتے ہیں اور بچی بے چاری ان کے پاس جانے کو ہر دم روتی رہتی ہے۔ میں نے سوچا کہ خود چھوڑ کر آؤں لیکن دفتر میں کام بھی زیادہ ہے اور چھٹی بھی نہیں ملتی۔ اس لئے لیجئے یہ آپ کا اور میری بھتیجی کی آمد و رفت کا کرایہ اور اوپر پچاس روپیہ آپ کا کمیشن۔ آج ہی شام کی گاڑی سے بچی کو پنڈی لے جائیے"۔

میں بزنس کے اس طرح ایک دم چل نکلنے پر بڑا خوش ہوا۔ رقم وصول کی۔ شام کی گاڑی سے آدمی کی چار سالہ بھتیجی کو پنڈی لے گیا اور چھٹے دن واپس آگیا۔ اب کوئی نہ پوچھے کہ اس چار سالہ بھتیجی نے راستہ بھر مجھے کتنا تنگ کیا ہے۔ ایک مرتبہ قیمتی سوٹ پر بول و براز ---- بھی باز نہ آئی ---- لیکن بزنس بزنس تھا۔ اور ہے۔ چند ہی دنوں میں میرا کاروبار خوب چل نکلا۔ لوگ باگ اپنے کاموں پر مجھے، ایران، توران، چین، جاپان حتیٰ کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی تک بھیجنے لگے۔ لیکن افسوس کہ ایک ذرا سی غلطی سے مجھے یہ بڑا نفع بخش کاروبار ختم کر دینا پڑا۔ وہ ذرا سی غلطی یہ تھی کہ ایک کلرک بابو میری دوکان پر آیا اور بولا:۔

"حاجی جی۔ وہاں لائل پور میں میری شادی کی تاریخ ۲ شعبان بالکل طے ہو چکی ہے لیکن میرا افسر اعلیٰ مجھے چھٹی نہیں دیتا۔ لڑکی والوں کا اصرار ہے کہ شادی ہو تو ۲ شعبان کو ہو ورنہ پھر کبھی نہ ہو۔ کیونکہ یہی لڑکی کی والدہ کی وصیت تھی، اب آپ میری جگہ لائلپور جائیے اور میرے نام

پر دولہا بن جایئے تاکہ شادی ۱۷ ار شعبان کو ہو جائے۔ میں اس دوران میں لائلپور پہنچ ہی جاؤں گا۔ یہ لیجئے آپ کی آمد و رفت کا کرایہ اور پچاس روپے کمیشن:

میں بڑا خوش ہوا کہ چلو عجب کاروبار ملا ہے۔ دوسری بار دولہا بننا پڑ رہا ہے۔ دلہن کسی کی سہی میں تو دولہا بنوں گا۔ میں فوراً لائل پور روانہ ہو گیا۔ اور ۱۷ ار شعبان کی صبح لڑکی والوں کے گھر دولہا بن کر پہنچ گیا اور کلرک بابو کا خط اسکے خسر کے حوالے کیا۔ اس جاہل اور بدتمیز بوڑھے نے اس کلرک کا بابو کا خط پورا بھی نہ پڑھا اور میرا گریبان پکڑ لیا بس اس کے بعد کچھ نہ پوچھئے میری وہ گت بنی کہ بیان نہیں کر سکتا چار روز لائل پور کے ہسپتال میں رہ کر کراچی پہنچا اور توبہ کی کہ یہ کاروبار بند کرونگا اور ایسی غلطی پھر کبھی نہ کروں گا۔ غلطی یہ تھی کہ وہ کلرک بابو میرے حاسدوں اور دشمنوں کا سکھایا پڑھایا ایجنٹ تھا۔ اس نے میرے خلاف یہ ایک ناپاک منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے دوکان سے فوراً سائن بورڈ اُتروا لیا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد ایک انوکھا بزنس ملا۔ یعنی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو موثر محبت نامے لکھنا سکھانے کا کاروبار!

محبت ناموں کے تھوک فروش بیوپاری

حاجی ابراھیم حاجی حلیبی اینڈ سنز

تو ڑجوڑیا بازار، کراچی

فون نمبر ۴۲۰ ــــــــــ تار کا پتہ: لیلیٰ کا قلم

ہمارا ٹریڈ مارک

یہ کاروبار خلاف توقع دوسرے ہی دن سے خوب چل نکلا۔ دن بھر سینکڑوں کی تعداد میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مجھ سے محبت نامے لکھوانے کے لئے آنے لگے۔ میرا کام اتنا بڑھ گیا کہ مجھے ہاتھ بٹانے کے لئے ایک غزل گو لکھنوی شاعر اور ایک ریٹائرڈ فلم ایکٹر کو اپنی فرم میں نوکر رکھنا پڑا۔ جب یہ کاروبار پورے شباب پر تھا تو ایک دن ایک شخص بڑے غصے کے عالم میں پولیس کے دو سپاہیوں کے ہمراہ میری دوکان میں آیا اور سپاہیوں سے گرج گرج کر کہنے لگا۔

"حوالدار صاحب۔ یہی ہے وہ مردود جس نے میری بیوی کو بُری راہ دکھائی ہے! اسے فوراً گرفتار کر لو۔"

حوالداروں نے مجھے فوراً گرفتار کر لیا اور تھانہ لے گئے اور مجھ سے سوالات کرنے لگے۔

"کیا تم شریفن بی بی کو جانتے ہو؟"

میں :- نہیں۔

حوالدار نے دوسرے حوالدار سے کہا ——— اور دوسرا حوالدار باہر جا کر ایک برقعہ پوش عورت کو لے آیا۔ پہلے حوالدار نے برقعہ پوش عورت سے پوچھا :-

پہلا حوالدار :- اس آدمی کو جانتی ہو۔

برقعہ پوش عورت :- جی ہاں۔

پہلا حوالدار :- (مجھ سے مخاطب ہو کر) اس عورت کو جانتے ہو۔

میں :- جی ہاں۔ یہ ہر روز دو مرتبہ میری دوکان پر آتی تھیں۔ ان کا نام عالم آرا ہے، اور یہ کسی انجم نامی نوجوان کے نام محبت نامے لکھوایا کرتی تھیں اور فی محبت نامہ دس روپے دیا کرتی تھیں۔

پہلا حوالدار:۔ یہ شخص اس کا شوہر ہے کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟

میں:۔ نہیں۔

پہلا حوالدار:۔ اس شخص کا نام کریم الدین ہے اور یہ عورت عالم آرا نہیں بلکہ شریفن بی بی ہے سمجھ گئے۔

میں:۔ اپنے کسی گاہک سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم شادی شدہ ہو یا نہیں ہو! اور تمہارا صحیح نام کیا ہے؟ بزنس تو آپس کے اعتماد سے چلتا ہے۔

دوسرا حوالدار:۔ اب ذرا جیل میں اپنا بزنس چلانا۔

اس کے بعد انہوں نے مجھے حوالات میں بند کیا۔ دوسرے دن عدالت میں پیش کیا۔ تیسرے دن جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور پورے تین ماہ بعد میں قید کاٹ کر رہا ہوا تو پہلے اس بزنس سے توبہ کی۔ لیکن پھر ایک نیا بزنس سوجھا اور خوب سوجھا۔ فوراً میں نے ایک نیا بورڈ پینٹ کروایا۔

اعلیٰ افسروں سے رشوت طے کرانے والے مستند ایجنٹ
حاجی ابراہیم حاجی جلیس اینڈ سنز تو ڈجوڈیا بازار کراچی
فون نمبر ۴۲ ـــــــــ تار کا پتہ:۔ دستخط شدہ نوٹ
اعلان
اگر کسی اعلیٰ افسر کے پاس آپ کا کوئی کام پھنسا ہوا ہو اور آپ رشوت دینے کے لئے آمادہ ہوں تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔ (فراڈ پبلسٹی)

لیکن جیسے ہی یہ بورڈ دوکان پر آویزاں کیا گیا اس کے چند گھنٹوں بعد پولس پھر آئی اور مجھے پکڑ کر انسپکٹر جنرل پولیس کے پاس لے گئی، اس نے مجھے بغور دیکھ کر انسپکٹر پولیس سے کہا۔

یہ شخص پاگل معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کو معاف کر دو۔"

اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:۔

"مسٹر اس بار تم کو معاف کر دیا جاتا ہے لیکن آئندہ کبھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ تم ایسا کوئی کاروبار نہیں کر سکتے"، جس سے افسروں کی بدنامی ہوتی ہو۔ اس طرح بورڈ لگا کر علی الاعلان تم ایسا کاروبار نہیں کر سکتے۔"

میں نے انسپکٹر جنرل کو خوش ہو کر سلام کیا اور لوٹ آیا۔ لیکن ہمت نہیں ہاری، اور ایک بالکل ہی نیا بزنس شروع کیا بالکل جدید جو بڑے مزے سے چل رہا ہے۔ نہ کوئی ناراض گاہک آیا اور نہ پولس اگر کسی بھائی کو میرے نئے کاروبار کا علم نہ ہو تو توڑ جوڑ بازار میں میری دوکان کا اشتہار یہ ہے۔

آپ کے شہر کے مشہور و معروف مکھی مار آپ کی طرف سے اُجرت پر آپ کے گھر کی مکھیاں مارنے والے مشہور و معروف کارندے جن کا مکھیاں مارنے کا ساری زندگی کا تجربہ ہے۔

ہم ہیں آپ کے خادم

حاجی ابراہیم حاجی حلیم اینڈ سنز، توڑ جوڑیا بازار کراچی

فون نمبر ۴۲۰ ——— تار پتہ:۔ ہیضے کی مکھی

(فراڈ پبلسٹی)

خدا کے فضل سے یہ کاروبار بڑے زوروں پر چل رہا ہے۔ اب جلنے والے جلا کریں۔ میں تو سرمایہ داری کو جی بھر کر دعا دیتا ہوں کہ اس نے حرام خوروں کی رسّی کتنی دراز کر رکھی ہے!

ذرا ایک منٹ

مجھے یقین ہے کہ آپ کو ہرگز یقین نہیں آئے گا کہ میں نیو یارک بھی ہو آیا ہوں چلیئے یقین نہ کیجیے تجربات تو سن لیجئے۔ بڑے کام کی بات ہے۔ آپ کے بھی کبھی نہ کبھی ضرور کام آئے گی۔ بشرطیکہ آپ خود نہ کام آگئے ہوں۔

ایک دن میری ہوسٹس لیڈی ہیملین نے مجھے بتایا کہ مجھے ایک فلم پروڈیوسر نے جو ہندوستان سے متعلق ایک فلم بنا رہا تھا۔ ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے لنچ پر دعوت دی ہے میں وقت مقررہ پر پروڈیوسر کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ ابھی ہمارا آپس کا تعارف بھی ختم نہ ہوا تھا۔ کہ اندر سے اس کی لیڈی آئی اور اس نے کہا۔

"لنچ تیار ہے"۔

ہم تینوں سیدھے لنچ ٹیبل پر جا بیٹھے۔ لنچ کے دوران میں اس نے ازراہ مزاح کہا۔

"میرے پیارے دوست ایا در کھو ان ڈشس کے علاوہ ایک اور بھی ڈش تمہیں کھانی پڑے گی۔

———— کیا سمجھے ؟

میں سمجھا شاید وہ مجھ سے سؤر کے گوشت کی ڈش کے بارے میں کہہ رہا ہے۔

تاہم میں نے پوچھ ہی لیا۔

"کون سی ڈش ؟"

اس نے جواب دیا۔

"سوالات کی ڈشس !"

یہ کوئی خاص مزاح تو تھا نہیں کہ میں مسکراؤں۔ لیکن جواباً مسکرانا داخلِ تہذیب ہے۔ اور میرا میزبان اور میزبانی۔ دونوں مسکرائے۔ اس لئے میں بھی مسکرایا، مسکرایا کیا۔ یوں سمجھئے کہ ان کی نقل اُتاری یا منہ چڑھایا۔

لنچ شروع ہوا۔ باتیں شروع ہوئیں اور اس نے ہندوستان کی سیاسی تاریخی جغرافیائی، معاشی، معاشرتی۔ تہذیبی اور جنسی زندگی کے بارے میں بیسیوں سوالات کر ڈالے جن کے جوابات کی ادائگی میری لقمہ سازی پر کافی اثر انداز ہوتی رہی۔ اور شاید بیس منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ لنچ ختم ہو گیا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ کڑوی کسیلی کافی کے دو دو گھونٹ پیئے۔ اس کے بعد بجائے اس کے کہ میں اپنے میزبان سے رخصت کی اجازت چاہی، میزبان نے مجھ سے رخصت چاہی۔ ہاتھ ملایا اور باہر چلا گیا — میں ہکا بکا ڈرائنگ روم میں کھڑا تھا کہ میری میزبان لیڈی مسکراتی ہوئی میری طرف آئی اور اس نے کہا — "لیجئے!"

میں نے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں دو چیک تھے۔ میں نے پوچھا۔

"یہ چیک کس لئے ؟"

اس نے جواب دیا۔

"یہ پچاس ڈالر کا چیک تو اس لئے کہ آپ نے ہمیں ہندوستان کے بارے میں ضروری

معلومات بہم پہنچائیں۔ اور یہ دوسرا پچیس ڈالر کا چیک اس لئے کہ آپ نے ہمارے ساتھ لنچ پر اپنے قیمتی وقت کے پچیس منٹ ضائع کئے۔"

میں یہ جواب سن کر حیران رہ گیا۔ لیکن اپنی ہندوستانی روایات اور تہذیب کے اصولوں کے مدنظر دونوں چیک لینے سے صاف انکار کر دیا۔ میرا انکار اس یسوع مسیح کی بندی کو بہت بُرا معلوم ہوا اور اس نے ذرا سا منہ بنا کر کہا۔

"مسٹر جلیس! آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں!"

یہ کہہ کر وہ گھڑی دیکھنے لگی۔ اور مجبوراً میں دونوں چیک لے کر باہر نکلا اور سوچنے لگا۔ وہ میرے یار عجیب ملک ہے یہ —— ایک منٹ کی قیمت ایک ڈالر ——! اور ایک اپنا جنت نشاں وطن پاکستان بھی ہے جہاں پوری پوری لمبی زندگیوں کی کوئی قیمت نہیں۔ میرا دل خوشی اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ چلو مفت میں پچہتر ڈالر مل گئے اور افسوس اس بات کا تھا کہ وطن عزیز میں وقت کی کتنی بے قدری ہے۔

مجھ پر اس لنچ کے واقعے نے ایسا اثر کیا۔ کہ سیدھے اپنے فلیٹ واپس پہنچ کر ایک ٹائم ٹیبل تیار کیا۔

صبح بستر سے اُٹھنا —— ٹھیک ساڑھے چھ بجے

باتھ روم —— سات بجے تک

ناشتہ —— سوا سات بجے تک

سگرٹ نوشی اور اخبار بینی —— ساڑھے آٹھ بجے تک

کالج —— نو بجے سے بارہ بجے تک

لنچ —— ایک بجے سے ایک بجکر ۲۰ منٹ تک

سگریٹ اور قیلولہ ——— ڈیڑھ بجے تک

ایک امریکن لڑکی کو اردو ٹیوشن ——— پونے دو سے تین بجے تک

پبلک لائبریری میں ——— تین بجے سے چار بجے تک

شام کی چائے ——— ٹھیک چار بجے سے سوا چار بجے تک

شام کی تفریح ——— سوا چار بجے سے نو بجے تک

محبت ——— سات بجے سے ۹ بجے تک

تھیٹر، سینما یا بال روم ——— نو بجے سے گیارہ بجے تک

بستر ——— گیارہ بجے سے ساڑھے چھ بجے تک

پہلے پہلے تو اس ٹائم ٹیبل پر عمل کرنے میں بڑی دقتیں محسوس ہوئیں۔ مگر رفتہ رفتہ ایک مہینے کے اندر ہی اندر میں اس کا عادی ہو گیا۔ آپ نے بچوں کے کسی نرسری روم میں ایک مشین نما آدمی ضرور دیکھا۔ جو بٹن دباتے ہی کھٹ سے کام کرنے لگتا ہے۔ اگر نہیں دیکھا تو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں میں تو صرف یہ بتا رہا تھا کہ میں بھی گویا مشین بن گیا تھا۔ ذرا اندازہ کیجئے نیویارک کی سردی میں صبح سویرے اٹھنا کیسے دل گردے کا کام ہے۔ بالخصوص خط استوا کے باشندوں کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں۔ مگر عزم بالجزم جوئے شیر لے آیا۔ اور لگاتار اتنا وقت کا پابند ہو گیا تھا کہ ایک بار میری گرل فرینڈ مس سوسی مارسین صرف پانچ منٹ دیر سے آئی۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ آج سے میری محبت کا وقت ٹھیک سات بجے سے ۹ بجے تک ہے۔ اگر یہ پابندی وقت تمہیں منظور نہیں تو پھر میرا استعفیٰ بہ حسرت دیا۔ اس نے میری بڑی منت سماجت کی کہ سوئے مسیح کے لئے صرف آدھا گھنٹہ اور بڑھا دو۔ نو کے بجائے ساڑھے نو بجے کر دو۔ مگر میں نے جواب دیا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ وقت سب سے بڑی محبت ہے۔ وقت جاوداں ہے محبوبہ مر سکتی ہے۔ مگر وقت کبھی نہیں مرتا۔"

ظاہر ہے کہ مس سوسی مارسین کو محبت میں تجارید وقت کی یہ تجویز قطعاً پسند نہ آئی۔ اور مجھے سوسی کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا پڑا۔ آپ اسے میری حماقت سمجھیں۔ لیکن اصول اصول ہے۔ اور قول مرداں ہمیشہ جان رکھتا ہے۔

آدمی سے مشین بنے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مجھے مجبوراً پاکستان آنا پڑا۔ جہاز پر سوار ہوتے وقت سچ مچ آنکھوں سے آنسو نکل آئے کہ ہائے ہائے کس ملک کو چھوڑ رہا ہوں اور کس ملک میں جا رہا ہوں۔ ہائے قسمت کس ملک میں پیدا ہوا تھا۔

امریکہ میں رہتے رہتے وطنِ عزیز سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ مگر امریکہ نے میرے دل میں اپنے وطن کے خلاف جو نفرت پیدا کی تھی۔ وہ نفرت برائے تخریب نہیں تھی بلکہ نفرت برائے تعمیر تھی۔ چنانچہ جہاز میں بیٹھتے ہی میں نے سوچا جیسے ہی وطنِ عزیز پہنچوں گا۔ وقت کی قدر کے سلسلہ میں ایک بڑی منظم اور ملک گیر مہم شروع کر دوں گا۔ اپنی زندگی کا ایک ہی نصب العین رکھوں گا۔ "وقت کی قدر" ایک طویل سفر کے بعد گھر پہنچا۔ پہلے دن تو سفر کی تکان اُتارتا رہا ٹرین میں رات بھر جاگنا پڑا۔ اس لئے دن کے کوئی ایک بجے الارم ٹائم پیس پر پورے چار بجے کا الارم لگا کر باورچی کو ٹھیک چار بجے چائے تیار کرنے کا حکم دے کر سو گیا۔

لیکن جب جاگا تو شام کے چھ بجے تھے۔ اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا ٹائم پیس کی طرف دیکھا تو الارم کا بٹن دبا ہوا تھا۔ میں نے چیخ چیخ کر سارے گھر کو جمع کیا کہ "اس الارم کا بٹن کس نے دبایا ہے بولو جواب دو۔" گھر والے حیران تھے کہ میں اتنی معمولی سی بات پر اتنا کیوں بگڑ گیا ہوں۔ میرے

سب سے چھوٹے بھائی سرتاج حسین نے آگے بڑھ کر جواب دیا:-

" بھائی جان نفیسہ سو رہی تھی۔ اس لئے میں ٹائم پیس اُٹھا لے گیا۔ اور اُسے بہلانے کے لئے الارم بجاتا رہا"

میں نے تڑاخ سے سرتاج کو ایک چانٹا رسید کیا سب بڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے حالانکہ مجھے اُنہیں حیرت سے دیکھنا چاہیئے تھا کہ کیسے ملک کے لوگ ہیں جہاں ٹائم پیس پابندئ وقت کے بجائے روتے ہوئے بچوں کو بہلانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

اپنے وقت بلکہ اپنی اوقات کا مستقبل مجھے بہت ہی گھناؤنا نظر آرہا تھا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو وہ مشہور ضرب المثل کی نسل کا فارسی مصرعہ سنایا۔ کہ ع مرد باید کہ ہراساں نہ شود اور آئیندہ دراحتیاط کے بدنظر باورچی کو ہدایت کی کہ ڈنر ٹھیک آٹھ بجے میز پر موجود ہونا چاہیئے۔ اور پھر ایوی ننگ اسٹرول پر چلا گیا۔ آٹھ بجنے میں کوئی پانچ منٹ کم تھے۔ گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ گھر میں بنجار اہل سے بی بی لوگ آئے ہوئے تھے اور باورچی نے اُنکے چائے پانی کے انتظامات میں ابھی تک کھانا پکانا بھی شروع کیا ہے۔ میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور چپکا ہو رہا۔ خدا خدا کرکے رات کے کوئی ساڑھے دس بجے ڈنر نصیب ہوا۔

نیویارک میں میں ٹھیک گیارہ بجے سو جانے کا عادی ہوں مگر یہاں ریڈیو فرمائشی ریکارڈوں کا پروگرام ہو رہا تھا۔ اور نفیسہ، صبیحہ، یوسف، شہنشاہ فاروق، سعیدہ اور دوسرے بھائی بہن بڑے شوق سے اپنی اپنی پسند کے ریکارڈ سن رہے تھے اُدھر نیند آرہی تھی اور اُدھر کوئی بے سُرا بھونڈی آواز میں گا رہا تھا۔

" دِل ٹوٹے نا دِل ٹوٹے نا"

بستر پر لیٹے لیٹے ایک ٹھنڈی آہ دِل سے نکل گئی ہائے کہاں وہ بے تھوون۔ مکارٹن ارنڈا

اور پالی رابسن کے گیت اور کہاں یہ ہسٹریکل چیخیں۔ وہ تو کہیے کہ جس وقت "اُڑ جا پنچھی اُڑ جا" کا ریکارڈ بج رہا تھا تب پنچھی کے بجائے لائٹ کا فیوز اڑ گیا اور اندھیرے نے سب کو سونے پر مجبور کر دیا۔ ورنہ نہیں معلوم یہ کمبخت ثریا۔ مدھو بالا۔ کامنی کوشل وغیرہ اپنی بے خوابی کے گلے شکوے سے میری نیند بھی اڑا دیتیں۔

دوسرے دن بجائے ساڑھے چھ بجے کے میری آنکھ ساڑھے آٹھ بجے کھلی۔ اور ناشتہ کوئی پونے دس بجے ملا۔ تو میں نے سوچا کہ اب میرا مقابلہ کرنا بیکار ہے۔ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے پنکچویلٹی وہ شاید لعنت بھیجو اپنے ٹائم ٹیبل پر۔ یہاں وقت کی پابندی کرنے سے کون سے ڈالر ملنے والے ہیں۔ لیکن دل نے کہا ایک آخری مقابلہ اور سہی۔

تیسرے یا چوتھے دن امریکہ سے کامیاب واپسی پر میرے اعزاز میں ایک پبلک جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ سارے اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں اور دیواروں پر جگہ جگہ پوسٹر لگائے گئے۔ بروز جمعہ شام کے ٹھیک ساڑھے پانچ بجے زعیم ملت حضرت ابراہیم جلیس کی امریکہ سے شاندار واپسی پر ایک جلسہ استقبالیہ زمرد محل ٹاکیز میں منعقد ہوگا۔ عورتوں کے لئے پردے کا خاص انتظام ہے۔ سامعین وقت کی پابندی کا خاص خیال رکھیں۔

جمعہ کے دن میں شام کے ٹھیک چار بجے تیار ہو گیا۔ اور ٹھیک ساڑھے پانچ بجے میں جلسہ گاہ پہنچا۔ تو وہاں اُلو تو نہیں بول رہا البتہ چند رضاکار کرسیاں وغیرہ ٹھیک کر رہے تھے۔ میں تو شرم سے پسینہ پسینہ ہو گیا۔ کیونکہ میری کار کے قریب دو تین نوجوان باتیں گفتگو کر رہے تھے۔

"لے بھئی زعیم ملت آ گیا۔ دیکھو تو سہی بیچارے کو شہرت کی کتنی بھوک ہے۔ وقت سے پہلے جلسہ گاہ پہنچ گیا ہے!"

کوفت کے مارے اسٹرینگ گھمایا اور کوئی ساڑھے چھ بجے تک حیدرآباد کی سڑکوں پر بے مقصد

گھومتا رہا اور کوئی ساڑھے چھ بجے جلسہ گاہ پہنچا۔ تو معلوم ہوا صرف آدھا ہال بھر سکا ہے۔ اور مزید آدھ گھنٹہ ہال بھرنے کا انتظار ہے۔ کوئی سوا سات بجے تک ہال بھر گیا۔ اور جلسہ شروع ہوا۔ رات کے کوئی گیارہ بجے ختم ہوا۔۔

میں واپس آکر ٹھیک وقت پر سونا چاہتا تھا کہ والد صاحب قبلہ میرے کمرے میں آ گئے۔ حقہ منگوایا۔ اور کوئی دو بجے تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پاسِ ادب مانع تھا۔ ورنہ صاف عرض کر دیتا۔ کہ قبلہ میں ٹھیک گیارہ بجے سونے کا عادی ہوں۔ مگر باپ باپ ہوتا ہے اور بالخصوص وطنِ عزیز کا باپ تو ......

میں ہمت ہار گیا۔ اور سوچا کہ کل صبح نو بجے جاگوں گا لیکن حیرت ہے کہ ٹھیک ساڑھے چھ بجے آنکھ کھل گئی۔ دل نے کہا۔ قدرت چاہتی ہے کہ میں کم از کم پابندیٔ وقت کا "مردانہ وار" طریقہ سے پروگرام جاری رکھوں ناشتہ بھی ٹھیک سوا سات بجے مل گیا۔ میں نے کہا کہ اچھا لو۔ آج سے پھر پروگرام شروع۔ ٹھیک نو بجے سے اپنے مطالعہ کا پروگرام شروع کیا تو میرے ایک رشتہ دار قاضی عزیز اللہ حسین صاحب تشریف لے آئے۔ اور کہا۔

"آج دوپہر ہمارے ہاں آپ کی دعوت ہے!"

میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ میں ٹھیک پون بجے آپ کے گھر پہنچوں گا۔ اور ٹھیک ڈیڑھ بجے تک دعوت سے فارغ ہو کر واپس ہو جاؤں گا۔ انہوں نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر وعدہ کیا۔

میں ٹھیک پون بجے ان کے گھر پہنچا۔ مگر معلوم ہوا کہ ابھی کھانے میں کچھ دیر ہے۔ میں غصہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"مجھے آپ کی دعوت نہیں چاہیئے۔ میں آپ کی دعوت کی خاطر اپنا وقت برباد نہیں کر سکتا۔"

قاضی عزیز الدین صاحب نے فرمایا۔

"ارے بھئی بہت وقت پڑا ہے۔ گھر جا کر تمہیں کیا کرنا ہے۔ چلو بیٹھو۔ تم سے ملنے کے لئے بہت سے لوگ آنے والے ہیں۔

اُنہوں نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر مجھے صوفے پر گرا دیا۔ کوئی ڈھائی بجے کے قریب سب مدعوئین آ گئے۔ ساڑھے تین بجے تک کھانا کھایا گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد میں چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ تو سبھوں نے پکڑ پکڑ کر مجھے بٹھا دیا۔ اور اس طرح رات کے کوئی آٹھ بجے تک میں وہاں بیٹھا بکواس کے چھرے سے وقت کو ذبح کرتا رہا۔

اپنے آپ پر طبیعت بہت جھلا رہی تھی۔ لیکن قدم قدم پر ماحول مجھے پے در پے شکستیں دیتا جا رہا تھا۔ گھر لوٹ کر پابندئ وقت کا کوئی اور پروگرام بنانا چاہتا تھا مگر گھر میں ایک اودھم مچا ہوا تھا۔ صفیہ بیگم کی زچگی کے دن قریب تھے اور آج انکی حالت زیادہ خراب تھی۔ سب ہی کہہ رہے تھے۔ کہ آج ان کے مشکوئے معلےٰ میں ضرور ولادت ہو گی۔ مگر ہماری جہاندیدہ دادی زور زور سے عورتوں کو ڈانٹ رہی تھیں ـــــ "نہیں نہیں زچہ کو گھر لیجانے کی ضرورت نہیں آج اس کی زچگی نہیں ہوگی میں جانتی ہوں۔ صفیہ کی ساتوں زچگیاں پورے دس مہینے کے بعد ہوتی ہیں"

میں یہ جملہ سُن کر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اور ٹھٹک کر نڈھال ہو گیا ـــــ اب میرے لئے کامیابی کی کوئی اُمید نظر نہ آتی ـــــ اور لیجئے اس مُلک میں تو بچے بھی وقت پر پیدا نہیں ہوتے ـــــ اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔

میں نے سوچا کہ کم از کم مجھے گھریلو ماحول سے نکلنا چاہیئے تو شاید پابندئ وقت کا کوئی امکان پیدا ہو۔

اتفاق کی بات ہے کہ انہی دنوں دہلی سیکریٹریٹ میں میرا تقرر ہو گیا اور میں بڑا خوش ہوا

اب تو میں اپنی زندگی کا آپ مختار ہوں۔

دوسرے دن دہلی جانے کے لئے اسٹیشن پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ ٹرین ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ طبیعت جھلائی میں نے کہا اب کل جاؤں گا۔ دوسرے دن اسٹیشن پہنچا تو پتہ چلا کہ ٹرین دو گھنٹہ لیٹ ہے۔ بڑا غصہ آیا۔ پھر لوٹ آیا۔ اور قسم کھائی کہ اسی دن جاؤں گا۔ جب دن گاڑی ٹھیک وقت پر آئے گی۔ پانچ دن کے بعد میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ ٹرین ٹھیک وقت مقررہ پر پلیٹ فارم سے لگی کھڑی ہے۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر کو مبارکباد دی کہ

"ماسٹر مبارک ہو آج تو ٹرین ٹھیک وقت پر آئی ہے"

لیکن ماسٹر نے جواب دیا:۔

"نہیں صاحب یہ تو کل کی گاڑی ہے۔ ایک دم چوبیس گھنٹہ لیٹ"

اگر میں ایک کمزور دل کا آدمی ہوتا۔ تو شاید اس کا یہ جواب سُن کر بے ہوش ہو جاتا۔

بس ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ اور ایک دم گاڑی میں سوار ہو گیا۔

دہلی پہنچا۔ دفتر میں رجوع ہوا۔ زندگی ذرا باقاعدہ ہو گئی۔ پھر ایک بار ٹائم ٹیبل کے ڈگر پہ پڑ گئی۔ اُمید کی کئی شمعیں جل اُٹھیں۔ حالانکہ اس دور میں بھی دو ایک بار مایوس کن واقعات سے دو چار ہونا پڑا لیکن میں بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ شیلو شا وال کلاک کی طرح ٹک ٹک ٹک ٹک زندگی گذارتا رہا۔

ان دنوں میں بڑا مجسمہ امید اور رجائی بن گیا ہوں لیکن صرف ایک جملہ میرے لئے بڑا حوصلہ افزا روح بنا ہوا ہے اور وہ جملہ یہ ہے۔

"ذرا ایک منٹ"

جب بھی کوئی شخص مجھ سے یہ کہتا ہے "ذرا ایک منٹ کے لئے بات تو سُنیئے" تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے ــــ اب بھلا آپ ہی ذرا انصاف سے بتائیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک منٹ کا وعدہ کر کے دس دس پندرہ منٹ تک باتیں کیجائیں۔ ارے بھئی کیوں نہیں جرأت کے ساتھ کہتے کہ ذرا پندرہ منٹ کے لئے بات سُنیئے، تو کیا میں انکار کر دوں گا ــــ یہ ذرا ایک منٹ کہنے کی مکاری کس قسم کی ہے۔

ابھی کل کی بات ہے۔ ایک خاتون میرے ساتھ الفنسٹن اسٹریٹ سے گذر رہی تھی۔ راستہ میں ان کی ایک سہیلی کسی کار میں نظر آگئی۔ وہ مجھ سے یہ کہہ کر اس کار کی طرف گئیں کہ "میں ابھی ایک منٹ میں آئی" ــــ میں لیمپ پوسٹ کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اور آپ یقین نہ کریں گے کہ وہ محترم خاتون کوئی بیس منٹ کے بعد اس کار سے باہر نکلیں۔

آج کل میں نے اس سوال پر غور کرنا چھوڑ دیا ہے کہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں، اور یہ "ذرا ایک منٹ" والی بے ہودگی کا کیوں ارتکاب کرتے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب مجھے مل چکا ہے۔ میں نے اب اپنے ملک کی معاشی اور سماجی زندگی میں اس کا جواب تلاش کر لیا ہے۔ ہمارا مُلک جب تک دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور معدودے چند دولت مندوں کے قبضے میں پھنسا رہے گا۔ اُس وقت تک لوگ بے کار رہیں گے بے روزگار رہیں گے۔ ان کے لئے ایک منٹ میں اور ایک دن میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہوگا۔ میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ وطنِ عزیز کے باشندے تیس تیس چالیس چالیس سال تک بیکار رہ کر زندگی گذار دیتے ہیں۔ یا اگر بیکار نہ ہوئے تو یوں سمجھیئے کہ ان کے تیس دن کی قیمت کم از کم تیس روپیہ اور زیادہ سے زیادہ تین سو روپے ہے۔ اسکے بعد تو بس اللہ بس اور باقی ہوس" کا دَور دَورہ ہے۔ ویسے یہاں ہر باپ اپنے بچوں کو اور ہر درسگاہ اپنے طالب علموں کو وقت کی پابندی کا بڑے شد و مد کے ساتھ درس دیتی ہے۔ اور یہ ہر پبلک

لائبریری اور ہوٹل میں اس قسم کے کتبے آویزاں دیکھے ہیں کہ

"وقت بڑی دولت ہے"

"زیادہ دیر بیٹھ کر اپنا اور دوسروں کا وقت خراب نہ کیجئے"

لیکن کوئی ان کتبوں کی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ باہر سڑکوں پر دیکھئے تو ایک ایک پیسے کے لئے فقیر اور بھیک منگے دن دن بھر اور رات رات بھر کھڑے رہتے ہیں۔

امریکہ میں ایک منٹ کی قیمت ایک ڈالر ہے۔ اور وطنِ عزیز میں ایک ڈالر کی قیمت ایک پوری زندگی ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک پبلیشر میرے پاس آیا تھا۔ وہ میرا سفرنامۂ امریکہ شائع کرنا چاہتا تھا میں نے اُس سے پوچھا معاوضہ کیا دو گے۔ تو اُس نے زیادہ سے زیادہ معاوضہ بتایا جملہ ڈیڑھ سو روپیہ میں نے کہا بندۂ خدا میں نے امریکہ ایک فلم پروڈیوسر سے ایک سوال کے جواب کے لئے ایک ڈالر وصول کیا ہے تو اُس نے جواب دیا ——"جناب من وہ امریکہ ہے۔ اور یہ پاکستان ہے"!

اپنے وطن کے لوگ دراصل ایک شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ احساسِ کمتری نے اُنہیں اس درجہ مجبور کر رکھا ہے کہ وہ چند ہاتھوں نے نہ صرف ان سے دنیا بلکہ ان کی عمریں اور زندگیاں تک چھین لی ہیں —— اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ اور اکیلا بے چارا ابراہیم جلیس سارے مُلک کو تو وقت کا پابند نہیں بنا سکتا۔ یہ ابراہیم جلیس وغیرہ کو چاہیئے کہ وہ پہلے طبقاتی نظام کے خلاف جد وجہد کریں۔ مُلک کو اور اس کے باشندوں کو سیاسی اور معاشی محکومی سے آزاد کرائیں۔ اس کے بعد زندگی کہیں ٹائم ٹیبل سے ہم آغوش ہو سکتی ہے۔

بحالتِ موجودہ تو ہماری زندگی وہ فیشن ایبل لڑکی ہے جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ذرا لپ اسٹک لگانے میں آدھ گھنٹہ صرف کر دیتی ہے۔ اور "ابھی ایک منٹ میں آئی"! کہہ کر

ساری ساری رات، ہجر کے کچوکے دیتی رہتی ہے۔

جانے کب آئے گا وہ وقت جب کہ وطنِ عزیز کا ایک منٹ بھی ایک روپیہ بن جائے گا ـــــــــ اُس وقت کے لئے مانگئے دُعا کہ ابھی وقت دُعا باقی ہے۔

بس سے بے بسی تک

انسان کو عجائبات سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے وہ ہمیشہ عجیب و غریب چیزوں کی دریافت اور تلاش میں سرگرداں اور مصروف رہتا ہے، دُنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں کوئی عجیب و غریب چیز نہ ہو اور دُنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں اس ملک کی حکومت کی نگرانی میں کوئی نہ کوئی عجائب خانہ نہ ہو حکومتوں کے علاوہ امیر اور رئیس لوگ (یا عجیب امیر لوگ) بھی اپنے محلوں میں ایک کمرہ یا ہال وغیرہ عجائبات کیلئے مخصوص رکھتے ہیں جہاں کسی بادشاہ کی پرانی تلوار، ایسا چاول کا دانہ جس پر پورا قرآن شریف تحریر ہو۔ وہ طلائی جام جس سے ہلاکو خاں شراب پیا کرتا تھا، غرضیکہ ایسی ایسی نادر چیزیں محفوظ رکھی جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی بزرگ مرد حکیم نے ایک بار یہ کہا تھا کہ

ع یہ دُنیا خود ایک عجائب خانہ ہے

دنیا میں اب تک سب سے زیادہ مشہور عجوبے صرف آٹھ عدد ہیں ان آٹھ عدد عجوبوں

میں سب سے زیادہ مشہور دیوارِ چین، قطب مینار، تاج محل، اہرامِ مصر پیرس کا ٹیڑھا ستون اور باقی تین عجوبوں کے نام یاد نہیں ہیں لیکن یاد نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عجوبے نہیں ہیں۔ البتہ ابھی تک کوئی نواں عجوبہ دریافت نہیں کیا گیا۔ ویسے لوگ باگ نیا عجوبہ دریافت کرنے کے بارے میں کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں ہیں۔ اسی لئے وہ نویں عجوبہ کو بطور تفنن، یا بطور محاورہ ضرور استعمال کر لیتے ہیں مثلاً اگر کوئی مجھ جیسا مشہور و معروف جھوٹا آدمی کبھی کبھار غلطی سے یا بے خیالی کے عالم میں سچ بولتا ہوا رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تو لوگ باگ کہہ اٹھتے ہیں ارے بھئی یہ دنیا کا نواں عجوبہ بھی ہے۔ اگر انسان پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کو معلوم کرنا چاہے تو وہ بڑی آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے اسے دریافت کرنے کے لئے نہ تو ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی ضرورت ہے نہ کسی عالمی سفر یا اتال پتال چھان ڈالنے کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیا میں میں واحد انسان ایسا ہوں جس نے دنیا کا نواں عجوبہ دریافت کر لیا ہے لیکن کسی ایسے مناسب وقت اور موزوں موقعہ کا متلاشی ہوں کہ اس کی تشہیر کر دوں۔ ورنہ اگر بے وقت اور بے موقع اس نویں عجوبہ کی تشہیر کر دوں اور مجھے تشہیر کے سارے ذرائع اور سامان میسر نہ آ سکے تو دنیا کی ایک بہت بڑی آبادی کو یہ شکایت رہ جائے گی کہ لو بھئی یہ بھی عجیب بات ہوئی۔ یہ تو اس جنگلی مور کا ناچ ہوا جو جنگل میں ناچتا رہا اور کسی نے دیکھا تک نہیں۔!

یوں بھی ہر چیز کا ایک وقت اور موقع ہوتا ہے۔ مجھے وقت اور موقع کی اس شدت سے اس لئے فکر دامن گیر رہتی ہے کہ میں خود بڑا بے وقت اور بے موقع پیدا ہوا ہوں۔ مجھ جیسے جینئس آدمی کو اس زمانے میں پیدا ہونا چاہیئے تھا جب کہ اس دنیا میں ارسطو، افلاطون بقراط، سقراط، گنگ فوزی، کنفیوشیس، فردوسی، دیو جانس کلبی وغیرہ موجود تھے۔

دراصل یہی تذکرہ صدر اصحاب میری فکر اور میرے مرتبہ کے حامل تھے۔ اب تو میں کچھ ایسے زمانے میں پیدا ہوا ہوں جبکہ میرے اِرد گرد ایسے دانش ور موجود ہیں جن پہ یہ پھبتی خوب صادق آتی ہے۔ کہ

"پڑھے نہ لکھے نام محمدؐ ترقی پسند"

ہاں تو پھبتی سے قطع نظر میں آپ کو یہ بتانے جا رہا تھا کہ اس دنیا میں ایک نواں عجوبہ بھی موجود ہے۔ اگر آپ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ اس نویں عجوبہ کی اُسی وقت عالمگیر تشہیر ہو گی جب میں چاہوں گا تو میں آپ کو اس عجوبہ کا نام بتا سکتا ہوں۔ لیجئے میں آپ پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے اس نویں عجوبے کا نام بتائے دیتا ہوں۔

وہ نواں عجوبہ وہ موٹر بس ہے جو میرے وطن پاکستان کے دارالخلافہ کراچی شہر کی سڑکوں پر ہر دم دوڑتی نظر آتی ہے جس میں کبھی آپ سوار ہوتے اور کبھی وہ آپ پر سوار ہو جاتی ہے۔ جب آپ اس پر سوار ہوتے ہیں تو آپ اِدھر سمندر میں کود پڑتے ہیں اور اُدھر جیل میں گھس جاتے ہیں۔

اور اس کے برخلاف جب وہ آپ پر سوار ہو جاتی ہے تو پھر آپ ایسے لمبے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

موٹر بس کہاں اور کس شہر میں نہیں ہوتی! یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ہر شہر اور آبادی میں ہوتی ہے لیکن صرف شہر کراچی کی موٹر بس ایسی ہوتی ہے جس کو آپ ایک متحرک عجوبہ قرار دے سکتے ہیں۔ ایک (MOBILE WONDER) اور بجا طور پر وہ دنیا کا نواں عجوابہ بننے یا کہلانے کی ساری صلاحیتوں کی حامل ہے۔ آپ نے چونکہ اب تک اُسے غور سے نہیں دیکھا تھا اس لئے آپ اس کو عجائبات عالم میں شمار نہیں کر سکے۔ لیکن مجھے یقین ہے

کہ میرے بتانے کے بعد آپ جب کسی موٹر بس کو دیکھیں گے تو میری عجوبہ شناسی بصارت اور بصیرت پر ایمان لے آئیں گے اور کہیں گے بھئی واہ مان گئے ہمتیں!

سچ مچ یہ نواں عجوبہ ہے۔ بس اب جس دن پاکستان جمہوریہ بنے گا اس مبارک دن اس دریافت کا تحفہ جمہوریہ پاکستان کے پہلے صدر اپنے ملک غلام محمد صاحب کی خدمت میں پیش کر دو۔ اور ایورسٹ فتح کرنے والے شیر یا تن سنگھ کی طرح نام و نمود کماؤ اور انعام و اکرام پاؤ۔ تاکہ تمہارے حاسد جلتے بھنتے رہیں۔ اور تمہارے دوست احباب اور رشتہ دار خوش ہو کر کہہ اٹھیں۔

"وجی پھٹے کے عیش ہو گئے"

پہلی بار کراچی آنے سے پہلے لاہور میں میں نے کسی اپنے جیسے (HACK WRITER) کا ایک مضمون پڑھا تھا جس کا عنوان تھا "کراچی کی آوازیں" اس مضمون میں خاص طور پر سب سے زیادہ ذکر یہاں کی موٹر بس کے کنڈکٹر کی آوازوں کا تھا جو صبح سے شام تک مسلسل چیختا رہتا ہے۔

"سیدھا بندر روڈ ٹاور کیماڑی کیماڑی کیماڑی کیماڑی' لارنس روڈ بنچہ لالو کھیت۔ گولیمار۔ جمشید روڈ۔ کالونی آؤ یار بیٹھو یار"

ان آوازوں کو دن بھر اور رات گئے تک مسلسل سنتے رہنے کی وجہ سے ایک اجنبی کے لئے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اسے کسی بھی بس اسٹاپ پر کراچی شہر کے سارے محلوں اور سڑکوں کے نام یاد ہو جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان آوازوں کا پاکستان کی اس آنے والی نسل پر برا اثر پڑ رہا ہے جو کراچی میں پیدا ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے، مجھے ڈر ہے۔ کہ کہیں آنے والی نسل کے پچاسی فیصد بچے بڑے ہو کر بس کنڈکٹر بننے کو ترجیح نہ دیں۔ میرے

اس اندیشہ کو تقویت اس طرح پہنچتی ہے کہ میرا تین سالہ بھتیجا دن بھر گھر میں چیختا پھرتا ہے۔

"سیدھا بندر روڈ ٹاور کیماڑی"

میں نے اس سے ایک دن پوچھا:-

"تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟"

اس معصوم نے فٹ سے جواب دیا۔

"بس کنڈکٹر"

اس وقت تو مجھے ہنسی آ گئی لیکن بعد میں مجھے بڑی فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں پاکستان کی آنے والی نسل زندگی کی شاہراہ کے بجائے سیدھا بندر روڈ پر ہی گامزن نہ ہو جائے۔

اس اندیشہ دور و دراز کو فی الحال نظر انداز کرتے ہوئے اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ غور کریں کہ آخر وہ کیا نوادرات ہیں جو کراچی کی بسوں کو ساری دُنیا کی بسوں سے ممیز و ممتاز کرتی ہیں اور اس کو ایک متحرک عجائب خانہ بنائے ہوئے ہیں تو ہمیں بس کو باہر سے دیکھنے اور اس کے اندر بیٹھ کر سفر کرنے کے علاوہ بس اسٹاپ کراچی کی سڑکیں، سڑکوں کی ٹریفک اور بس اسٹاپ میں سوار ہونے کے طریقے، اور بس کے اندر اور باہر لکھے ہوئے اشعار اور ہدائیتوں، بس کنڈکٹر اور ڈرائیور کی زبان لباس اور برتاؤ کا مجموعی طور پر لحاظ کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہی ساری چیزیں مل ملا کر کراچی کی بس کو "نادر روزگار" بنا دیتی ہیں۔

بعض لوگ جو جسمانی اعتبار سے کمزور اور اعصابی لحاظ سے مریض واقع ہوئے ہیں ان کا یہ خیال ہے کہ بس نادر روزگار ہو یا نہ ہو کراچی کی بس میں سوار ہونا یقیناً ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ مجھے بعض لوگوں کے اس خیال سے پورا پورا اتفاق ہے۔ میں خود بھی چونکہ ان "بعض لوگوں" کے زمرے میں شامل ہوتا ہوں اس لئے جب کسی بس میں سوار ہو

جاتا ہوں تو پھر بھی محسوس کرتا ہوں کہ مجھ سے یقیناً یہ معجزہ سرزد ہوا ہے۔ آپ کراچی کے کسی بس اسٹاپ پر کھڑے ہو جائیے آپ کو وہاں ایک ایسا ہجوم نظر آئے گا جیسے وہاں کوئی فٹ پاتھ کا حکیم تقریر کر رہا ہو اور دوائیاں، سرمہ اور تیل بیچ رہا ہے۔ یا پھر کوئی مسمریزم کرنے والا جادوگر یا مداری مجمع لگائے ہوئے جیسے ہی بس اس اسٹاپ پر آتی ہے تو لوگ اس کی طرف بے تحاشا دوڑتے ہیں جیسے بس پر حملہ کرنے والے ہوں۔ یا وہ بس کسی غنیم ملک کی بس ہے۔ دھکا پیل۔ مار پیٹ اور جیب تراشی قسم کے سنسنی خیز واقعات چشم زدن میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ جو طاقت ور ہوتا ہے بس اُس کی ہوتی ہے اس لئے اُردو زبان میں ایک نیا محاورہ ایجاد کیا گیا ہے۔

جس کے بازوؤں میں بل ہے وہ بس لے جاتا ہے یا بس اُس کو لے جانے پر مجبور ہے۔

اور جو ہماری آپ کی طرح "اُردو غزل کا شعر" ہے وہ بس سڑک پر گنگناتا رہ جاتا ہے۔ چلئے آپ بس میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن بیٹھیں گے کہاں۔ ساری نشستیں بھر چکی ہیں دو آدمیوں کی نشست پر تین آدمی اور تین آدمیوں کی نشست پر پانچ آدمی تشریف فرما ہیں۔ بس کنڈکٹر سے شکایت کیجے کہ

"بس میں جگہ نہیں تو تم نے ہمیں چڑھایا کیوں"۔

خوش خلق اور زندہ دل کنڈکٹر مسکرا کر جواب دیتا ہے۔

"بابو جی بس میں جگہ ہو یا نہ ہو دل میں جگہ ہونی چاہیے"۔

اس کے بعد وہ آپ کو اپنے دل میں جگہ دینے کے بجائے کسی صاحب کے گھٹنوں پر بٹھا دیتا ہے اور جب بس ہچکولے کھاتے ہوئے آگے بڑھتی ہے تو وہ صاحب گھٹنا مارتے رہتے

ہیں اور آپ کی آنکھ پھوٹتی رہتی ہے۔ یعنی بس چلتی رہتی ہے اور آپ پھوٹی ہوئی آنکھوں سے بس کے اندر لکھے ہوئے ارشادات اور ہدایات پڑھتے رہتے ہیں۔

"جملہ ۲۸ نشستیں"

لیکن چونکہ دل میں بڑی جگہ ہے اس لئے بس میں ۷۵ آدمی بیٹھے ہیں۔

"اپنے جسم کا کوئی حصہ گاڑی سے باہر نہ نکالیے"

بس کے سارے مسافروں کی کہنیاں اور سر کھڑکیوں کے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ اور ایک صاحب جو دوسرے اصحاب کی رانوں پہ لیٹے ہوئے ہیں ان کے دونوں پاؤں بس کے باہر ہیں۔

"ایک روپیہ سے زیادہ ریزگاری نہیں ملے گی"

ہر مسافر کم سے کم پانچ روپے اور زیادہ سے زیادہ سو روپے کے نوٹ بھنا رہا ہے۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

سامنے کی نشست پر بیٹھی ہوئی خواتین یہ شعر پڑھ پڑھ کر کچھ سوچ میں ڈوب گئی ہیں کہ کریں تو کیا کریں سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کرنا تو خیر کوئی مشکل بات نہیں لیکن دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کرنا والدین اور شوہروں کو دعوتِ مار کٹائی دینے سے کم نہیں ہے۔ البتہ پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے نوجوان یہ شعر پڑھ پڑھ کر بار بار انشاءاللہ تعالےٰ کا ورد کر رہے ہیں۔

ہر مسافر کو ہے لازم صبر کرنا چاہیئے
جب کھڑی ہو جائے گاڑی تب اُترنا چاہیئے

اکثر مسافر جو اپنے اپنے اسٹاپ پر اُترنے میں ناکام رہے تھے۔ وہ کنڈکٹر سے

اُلجھ رہے تھے کہ ایک طرف تو تم گاڑی کھڑی ہونے کے بعد اُترنے کا ڈھنڈورہ دیتے ہو اور گاڑی کہیں بھی رو کتے نہیں ہو۔ اس کا جواب کنڈکٹر دے رہا ہے۔

"بھائی صاحب وہ ہدایت نہیں شعر ہے شعر، آپ ہی سوچئے کہ گاڑی کبھی رُکتی ہے؟ جب کہ کبیر داس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

"چلتی کا نام گاڑی"

اِسی دوران میں اس چلتی کا نام گاڑی میں اُترنے کی کوشش کرتے ہوئے کوئی مسافر سڑک پر گِر پڑتا ہے اور گاڑی کا پچھلا پہیہ اس کے سر کو کچلتے ہوئے آگے نکل جاتا ہے۔ عورتیں چیخ پڑتی ہیں۔ مرد افسوس کرتے ہیں اور بوڑھے "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون" پڑھتے ہوئے ڈرائیور کے سامنے آئینہ کے اُوپر لکھے ہوئے اس شعر کو پڑھتے ہیں۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں

ممکن ہے کہ آپ یہ سوچیں کہ مالکان بس نے یہ شعر بس میں "احتیاطی تدابیر" کی خاطر لکھوایا ہو کہ بس سے گرنے کی اور مرنے کی ذمہ داری بس پر عائد نہیں ہوتی بالکل اسی طرح جیسے اخبارات میں چھپنے والے مراسلوں کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ

"ایڈیٹر کا مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں"

نہیں یہ بات نہیں ہے ایسے اشعار تو محض بس کی اندرونی زیبائش وغیرہ اور مسافروں کے ذوقِ شعری کی تسکین کے لئے لکھوائے جاتے ہیں۔ ہاں اگر ضمناً اس سے درسِ عبرت نکلتا ہو تو

"مالکان بس کا مسافروں سے متفق ہونا ضروری نہیں"

اور اگر کوئی ورسِ عبرت نکلتا تو پھر کسی حادثے کے بعد پولیس والے ڈرائیور کو کبھی نہ گرفتار کرتے یا پھر گرفتار کرنے سے پہلے یہ شعر پڑھ کر "خوب کہا" کہتے ہوئے گرفتاری سے توبہ کر لیتے۔

بس کا دوسرا نادر نمونہ (جو بس کو عجوبہ بناتا ہے) وہ کنڈکٹر کی ذاتِ گرامی ہوتا ہے وہ ہمیشہ متعفن خاکی بس شرٹ اور پاجامے میں ملبوس ہوتا ہے داڑھی بڑھی ہوئی آنکھوں میں چیپڑ، دانت میلے، سر کے بال ایسے جیسے سوکھی گھاس جو آپ کو ٹکٹ دینے کے بعد بھی ٹکٹ لینے کا اُس وقت تک مطالبہ مسلسل کرتا رہے گا جب تک آپ بس سے اُتر نہ جائیں۔ وہ آپ سے کبھی تمیز سے بات نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس کے اِرد گرد بس میں ہمیشہ ایک "طوفانِ بدتمیزی" برپا رہتا ہے۔ اس کا نفسیاتی اثر لازمی ہے، آپ اگر مرد ہوں تو وہ ٹکٹ دینے کے علاوہ کشتی لڑنے کے لئے بھی تیار ہو جائے گا۔ اور اگر عورت ہوں تو ایک ہی سانس میں ٹکٹ کے دام کا مطالبہ کرے گا اور گنگنائے گا۔

ڈر نہ محبت کر لے ڈر نہ محبت کر لے

ایسے کنڈکٹر آپ کو دُنیا کے کسی شہر کی بس میں نظر نہیں آئیں گے۔ اگر نظر آئیں گے تو صرف اپنے پیارے وطن پاکستان کے پیارے دارالخلافہ کی پیاری بسوں میں نظر آئیں گے۔ اور اس لئے نظر آئیں گے کہ وہ کراچی کی بس کو دُنیا کا نواں عجوبہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ یا غیر شعوری طور پر ایسا کوئی منصوبہ رکھتے ہیں میرا یہ دعویٰ ہے۔ کہ کراچی کی بس میں صرف وہی شخص سفر کر سکتا ہے جس کا دِل گردہ مضبوط ہو۔ ورنہ کمزور دل گردے کا آدمی اس وقت بمشکل ہی صحیح سلامت رہ سکتا ہے۔ جبکہ اگلے اسٹاپ کے ایک ایک پسنجر کو حاصل کرنے کے لئے ایک سمت جانے والی دو بسیں ایک دوسرے سے سبقت

لیجانے کی کوشش کرتی ہیں اور بسوں کی ریس شروع ہو جاتی ہے۔ اس ریس میں راہگیر سائیکل سوار موٹریں گرتی پڑتی مرتی کچلتی اُلٹتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن اگلے مسافر کا ڈیڑھ آنہ یا ڈھائی آنہ ان سب سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کے علاوہ بھی وطنِ عزیز کے نوجوان بس ڈرائیور اور کنڈکٹر فطرتاً "اسپورٹسمین" واقع ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی بجائے خود ایک اسپورٹ ہوتی ہے۔

جس طرح بس میں سوار ہونا کسی معجزے سے کم نہیں اسی طرح بس سے اُترنا بھی کسی معجزے سے زیادہ نہیں۔ بس سے وہی شخص آسانی سے اُتر سکتا ہے جو فنِ کشتی کا ماہر ہو بڑی طاقت سے پنجہ لڑا سکتا ہو، سمندر کی متلاطم موجوں میں تیر سکتا ہو یا اس کے آباؤ اجداد نے کبھی بحرِ ظلمات میں گھوڑا دوڑایا ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بس میں چڑھنے والے چڑھ نہیں پاتے اور اُترنے والے اُتر نہیں سکتے صرف بس میں بیٹھے اپنی بے بسی کا ماتم کرتے رہتے ہیں۔

بعض نستعلیق قسم کے لوگ ناک بھنویں چڑھا کر اکثر یہ کہتے ہوئے سُنے گئے کہ "یہاں بس اسٹاپ پر کیو سسٹم (قطار بندی کا طریقہ) ہونا چاہیئے"۔ یہ نستعلیق لوگ بالعموم باہر کے متمدّن ممالک کی سیر کر آئے ہوتے ہیں اور وہاں کی بسوں کے بہترین انتظامات کے رطب اللسان ہوتے ہیں لیکن وہ نستعلیق لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ پاکستانی قوم ایک آزاد قوم ہے اور ابھی حال میں آزاد ہوئی ہے وہ کسی کی نوکر یا غلام تو نہیں ہے کہ قطار باندھ کر غلاموں کی طرح کھڑی ہو کھڑے ہونے کے دن رات تو ۱۴۔ اگست ۴۷ء سے پہلے ہی لد گئے۔ اب کسی مائی کے لعل میں اتنی مجال نہیں کہ وہ ایک آزاد قوم کو ایک قطار میں کھڑا کر سکے یا ایک قطار میں ہانک سکے۔ میرا جہاں تک خیال ہے کراچی کے اربابِ نظم و نسق بھی عوام کو قطار بندی کی غلامانہ عادت سے باز رکھنا چاہتے ہیں اور اسی لئے بس اسٹاپ پر کھڑے

ہوئے پولیس کے سپاہی بس اسٹاپ کی بھیڑ بھاڑ، مار پیٹ لڑائی جھگڑے میں اس وقت تک مداخلت نہیں کرتے یعنی آپ کی آزادی میں مخل نہیں ہوتے" جب تک آپ کے سر سے لہو نہ بہنے لگے۔ یا پھر آپ کی جیب نہ کٹ جائے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے نوادرات ہیں جو کراچی کی بس کو دنیا کا نواں عجوبہ بنا دیتے ہیں، لیکن ان سب کا تفصیلی ذکر اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ ابھی اس مبارک دن کا انتظار ہے جس دن پاکستان ایک جمہوریہ بن جائے گا اور اسی دن "سوتے ہوئے گورنر جنرل کو جگا کر یہ نواں عجوبہ بالکل اسی طرح نئے صدر جمہوریہ کو پیش کریں جس طرح ایورسٹ کی فتح کو سوئی ہوئی ملکہ الزبتھ کو جگا کر اس کی تاجپوشی کے دن پیش کیا گیا تھا۔ اس وقت تو ہر اخبار کے ضمیمے نکالے گا۔ کتابیں چھپیں گی۔ استقبالی تقریبیں منعقد ہوں گی۔ ساری دنیا میں واہ واہ مچے گی۔ دھوم دھڑکا ہوگا۔ یہ ہوگا، وہ ہوگا۔ اس وقت تک کے لیے اس نویں عجوبہ کو راز میں رکھنا چاہیئے۔ آپ کا اور میرا وعدہ بھی یہی ہے۔ اب آیئے گھر چلتے ہیں۔ یہ سامنے بس اسٹاپ ہے وہاں سے بس پکڑتے ہیں۔ مگر ذرا احتیاط سے کیونکہ کسی ڈرائیور قسم کے شاعر نے کہا ہے۔

ع۔ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں

غنڈہ

کردار

آدم خاں ـــــــ ایک تعلیم یافتہ مہاجر

آنسہ بیروزگاری خانم ـــــــ آدم خاں کی دوسری غیر منکوحہ بیوی

بی بی مفلسی خانم ـــــــ آدم خاں کی سالی

مصیبت بی بی ـــــــ آدم خاں کی ساس

روزگار خاں ـــــــ عوام کی نظروں سے اوجھل رہنے والی شخصیت

(دو مالکان ہوٹل۔ ایک سرکاری افسر۔ پولیس کے چند سپاہی، ایک دفتری بابو

،، چپڑاسی۔ ایک ہوٹل کا بیرا۔)

زمانہ ـــــــ نہ ماضی نہ مستقبل

مقام ـــــــ روزگار دلانے والے دفتر کے ارد گرد

تمہید

ان دنوں جب سرزمین ہمالہ کے دامن میں ایک نیا ملک پاکستان بنایا گیا اور کچھ ہندی مسلمان ہندوستان کو خیرباد کہہ کر اپنے نئے وطن پاکستان کی طرف روانہ ہوئے تو سب سے پہلا غریب مہاجر جو پاکستان پہنچا اس کا نام آدم خاں تھا۔ ہندوستان سے پاکستان روانہ ہونے سے قبل اس نے اپنے والدین بھائی بہنوں اور بیوی بچوں کو تسلی دی تھی کہ وہ پہلے اکیلا اس لئے روانہ ہو رہا ہے کہ پاکستان پہنچ کر پہلے وہ روزگار خاں سے ملے گا پھر اس کے بعد ان سب کو پاکستان بلائے گا۔ تاکہ انہیں رہنے، کھانے اور کپڑے پہننے کی کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ آدم خاں پاکستان میں صرف ایک شخص سے واقف تھا جس کا نام روزگار خاں تھا۔ روزگار خاں اس سے واقف نہ تھا۔ لیکن آدم خاں کے ہاتھ میں بی اے کی ڈگری تھی۔ روزگار خاں سے تعارف کے لئے وہ ڈگری بہت کافی تھی۔ پاکستان کے دارالخلافہ کراچی پہنچ کر آدم خاں نے سب سے پہلے "اللہ کی رحمت کے پاکستانی ہوٹل" میں دو روپیہ روزانہ کرایہ پر ایک کمرہ لیا اور ہوٹل کے مالک سے معلومات کیں کہ روزگار خاں کہاں مل سکتا ہے۔ روزگار خاں چونکہ بڑی شہرۂ آفاق شخصیت ہے اس لئے ہوٹل کے مالک نے اُسے بتا دیا کہ روزگار خاں محمد علی جناح روڈ نشاط سینما کے سامنے والی عمارت میں رہتا ہے۔ اور اس عمارت کا نام ہے --- ایمپلائی منٹ اکس چینج۔ آدم خاں ڈھونڈتا ڈھونڈتا ایمپلائی منٹ اکس چینج کے دفتر پہنچ گیا۔)

Firdo
4
Faru

منظر اوّل

(پردہ اُٹھتا ہے۔ ایمپلائی منٹ اکس چینج کے دفتر کے ورانڈے میں چق پڑی ہوئی ایک دروازے کے ساتھ رکھی ہوئی ایک چوبی بنچ پر آدم خاں اور چھ سات آدمی خاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چق اٹھتی ہے۔ اندر سے ایک چپڑاسی باہر نکلتا ہے اور آدم خاں سے پُوچھتا ہے۔)

چپڑاسی:۔ کس سے ملنا چاہتے ہو؟

آدم خاں:۔ روزگار خاں صاحب سے۔

چپڑاسی:۔ روزگار خاں صاحب سے ملنے کے لئے پہلے ان کے سیکریٹری صاحب سے ملنا پڑتا ہے۔

آدم خاں:۔ تو چلو پھر سیکریٹری صاحب سے ہی ملوا دو۔!

چپڑاسی:۔ سیکریٹری صاحب سے ملنا اتنا آسان نہیں جتنا کہنا آسان ہے۔

آدم خاں:۔ کیوں اس کے لئے کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں؟

چپڑاسی۔ کبھی کسی سرکاری دفتر میں پہلے گئے ہو تو تمہیں طریقہ معلوم ہونا چاہیئے۔

آدم خاں:۔ (سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچکر) اچھا اچھا سمجھ گیا (چپ چاپ جیب سے ایک اٹھنی نکال کر چپڑاسی کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے) بھئی معاف کرنا میں بھول گیا تھا۔

چپڑاسی:۔ خیر کوئی بات نہیں۔ آئندہ سے احتیاط کرو اور چلو اندر۔

(چپڑاسی چق اُٹھاتا ہے آدم خاں اندر جاتا ہے۔ اندر ایک میز پر فائیلوں کے اتنے اونچے ڈھیر رکھے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ ان فائیلوں کے پیچھے کُرسی پر کوئی بیٹھا ہے یا نہیں، آدم خاں میز کے قریب جاکر فائیلوں میں سے جھانک کر دیکھتا ہے تو ان فائیلوں کے پیچھے بیٹھا ہوا ایک سیاہ فام چیچک رو اور

گنجا آدمی چونک پڑتا ہے اور پوچھتا ہے۔

"کون ہو تم؟"

آدم خاں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹتا ہے لیکن چپڑاسی مُسکراتا ہوا صاحب سے کہتا ہے۔

"صاحب یہ آدم خاں ہے آدم خاں!"

صاحب:۔ کیا مانگتا ہے؟

آدم خاں:۔ حضور روزگار خاں صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔

صاحب:۔ روزگار خاں صاحب ان دنوں بہت مصروف اور بڑے عدیم الفرصت ہیں اس لئے تم اپنا نام، پتہ اور دیگر تفصیلات مجھے لکھوا جاؤ۔ جب بھی تمہارا نمبر یا باری آئے گی تمہیں خود بُلا لیا جائے گا (ایک رجسٹر کھول کر)۔

صاحب:۔ تمہارا نام؟

آدم خاں:۔ آدم خاں۔

صاحب۔ قومیّت؟

آدم خاں۔ مہاجر۔

صاحب:۔ تعلیم ـــ؟

آدم خاں۔ بی۔اے۔

صاحب:۔ پیشہ ـــ؟

آدم خاں:۔ روڈ انسپکٹری

صاحب۔ پتہ ـــ!

آدم خاں :- کمرہ ۲۲۵ اللہ کی رحمت کا پاکستانی ہوٹل نزد کھوڑی گارڈن بمبئی بازار۔ کراچی

صاحب :- اب جاؤ۔ جب ہم بلائیں آجانا۔

(آدم خاں باہر نکلتا ہے اور پردہ گرجاتا ہے)

آدم خاں یہ سوچتا ہے کہ چلو جب نمبر آئے گا تب مسٹر روزگار خاں سے ملاقات کر لیں گے، ابھی کیا جلدی پڑی ہے، ابھی تو جیب میں پچاس روپے باقی ہیں۔ جو دس بارہ دن کے لئے کافی ہیں۔ اس کے بعد دس بارہ دن تک آدم خاں نے کراچی کی خوب جی بھر کر سیر کی۔ لیکن تیرھویں دن وہ بہت پریشان ہوگیا۔ کیونکہ اس کی جیب میں صرف پانچ روپے باقی رہ گئے تھے۔ اور روزگار خاں نے ابھی تک اُسے طلب نہیں کیا تھا۔ پریشان ہو کر اُس نے روزگار خاں اور اس کی عدیم الفرصتی کو علیحدہ علیحدہ دو موٹی موٹی گالیاں دیں اور پیدل جوتیاں چٹخاتا ہوا پھر امپلائی مَنٹ اکس چینج کے دفتر پہنچا۔

منظر دوم

(پردہ اُٹھتا ہے ـــــ وہی پہلے منظر کا ورانڈہ ـــ چپڑاسی آدم خاں کو دیکھ کر مسکراتا ہوا پوچھتا ہے۔)

چپڑاسی :- تم پھر آگئے ؟

آدم خاں :- ہاں یار۔ اب تک روزگار خاں صاحب نے طلب نہیں کیا۔ گھر سے لائے ہوئے روپے ختم ہو رہے ہیں۔ آج تو کسی طرح روزخاں سے ملا ہی دو۔

(یہ کہتے ہوئے آدم خاں جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے اور چونی اس کی ہتھیلی پر رکھ

کر اس کی مٹھی بند کرتے ہوئے کہتا ہے)۔

آدم خاں :۔ یار معاف کرنا ۔ اس مرتبہ اتنا ہی ۔ اگر روزگار خاں صاحب سے آج ملاقات ہوگئی تو بس سمجھ لو نہال کر دوں گا۔

چپڑاسی :۔ چلو اللہ تمہیں کامیاب کرے۔

(صاحب کے کمرے کی چق اٹھاتا ہے اور آدم خاں اندر صاحب کے سامنے پہنچتا ہے)۔

صاحب :۔ کون ہو تم ؟

آدم خاں :۔ حضور نے پہچانا نہیں ۔ میں آدم خاں ہوں ۔

صاحب :۔ آدم خاں ؟ کون آدم خاں ۔ اے میاں یہاں روزانہ سینکڑوں آدم خاں آتے ہیں اُن میں سے تم کون سے آدم خاں ہو ۔ اپنا کچھ حدود اربعہ تو بتاؤ ؟

آدم خاں :۔ میں آپ سے بارہ دن پہلے ملا تھا۔

صاحب :۔ واہ کیا بات ہوئی یہ ! بارہ دن پہلے تھا !! کیا چاہتے ہو ؟ کیوں آئے ہو ؟

آدم خاں :۔ حضور ! روزگار خاں صاحب سے ملنا چاہتا ہوں ۔

صاحب :۔ کسی کی سفارشی چٹھی لائے ہو ؟

آدم خاں :۔ نہیں بی اے کی ڈگری لایا ہوں ۔

صاحب :۔ بی اے کی ڈگری سے کیا ہوتا ہے ؟ لوگ یہاں ایم ۔ اے اور پی ' ایچ ڈی کی ڈگری لاتے ہیں ۔ اچھا تمہارے رشتہ داروں میں یہاں کوئی اعلیٰ عہدے پر ہے ؟

آدم خاں :۔ نہیں ۔

صاحب ۔ کوئی بھی رشتہ ' کچھ وشتہ ؟

آدم خاں :۔ نہیں ۔

صاحب :۔ کچھ نہیں تو پھر مجھے افسوس ہے کہ روزگار خاں صاحب سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکتی۔

آدم خاں :۔ صاحب یہ کیا غضب ہے؟ میں مر جاؤں گا۔

صاحب :۔ میرا وقت مت خراب کرو۔

آدم خاں :۔ صاحب ایسا غضب نہ کیجئے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ایمپلائمنٹ اکسچینج کے دفتر میں ......

صاحب :۔ یہ ایمپلائمنٹ اکسچینج .....

آدم خاں :۔ جی جی ـــ فرمایئے کوئی اُمید افزا بات کہیئے۔

صاحب :۔ تم راستہ بھول گئے ہو۔ یہاں کوئی روزگار خاں نہیں رہتے۔

(آدم خاں کے پیروں تلے زمین بلکہ پاکستان نکل گیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے عاجزی سے کہا۔)

آدم خاں :۔ صاحب مجھ پر رحم کیجئے۔ یہ میری بی اے کی ڈگری ملاحظہ کیجئے۔ یہ میرے پروفیسروں کے صداقت نامے۔

صاحب :۔ اچھا بتاؤ ایمپلائمنٹ اکسچینج کے دفتر کے کیا معنیٰ ہوتے ہیں؟

آدم خاں :۔ روزگار خاں سے ملانے والا دفتر۔

صاحب :۔ واہ رے میرے گریجویٹ! میں لفظی ترجمہ پوچھتا ہوں۔

آدم خاں۔ لفظی ترجمہ؟ لفظی ترجمہ ہے ملازمتوں کا تبادلہ۔

صاحب۔ شاباش۔ آفریں۔ بالکل ٹھیک ترجمہ کیا ہے۔

آدم خاں۔ (خوش ہو کر) دیکھا آپ نے۔ مان لیا نا آخر کہ میں کتنا ماہر مترجم ہوں۔ بس

اب ذرا روزگار خاں صاحب کی زیارت کرا دیجئے۔

صاحب۔ اماں تم بڑے اُول جَلُول آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں نے تمہیں بتایا کہ یہ ایمپلائی منٹ اکس چینج کا دفتر ہے۔ بحوالہ تمہارا ترجمہ یہاں ملازمتوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اب اگر تمہارے پاس کوئی ملازمت ہو تو لاؤ دکھاؤ۔ سودے کی بات کریں۔ اور ہم سوچیں کہ اس کے عوض ہم کس ملازمت سے اس کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔

آدم خاں پھر سٹپٹا گیا اور بولا۔

آدم خاں:۔ ملازمت! میرے پاس ملازمت!! اگر میرے پاس ملازمت ہوتی تو میں آپ کے پاس کیوں آتا بھلا؟ اور نعوذ باللہ اس کا تبادلہ کیوں کراتا۔ نہ صاحب نہ، مجھے یہ مذاق پسند نہیں۔ بس اب سیدھی طرح روزگار خاں صاحب سے ملوا دیجئے۔ ورنہ ....

(صاحب ایک دم غضبناک ہو کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں)

صاحب:۔ کیا کہا؟ "ورنہ" کہا! ہیں تیری اتنی مجال!! میں پچھلے بیس برس سے افسری کی کرسی پر بیٹھ رہا ہوں۔ آج تک کسی نے میرے روبرو "ورنہ" کہنے کی جرأت نہیں کی تو نے "ورنہ" کہہ دیا۔ ٹھہر ابھی تجھے مزہ چکھاتا ہوں۔"

آدم خاں:۔ (گھبرا کر عاجزانہ لہجے میں) حضور ـــ "ورنہ" کوئی گالی تو نہیں۔ اگر آپ کو اس کے معنی معلوم نہیں تو ـــ"

صاحب:۔ (پاگل کی طرح چیخ کر) کیا کہا ب مجھے "ورنہ" کے معنی نہیں معلوم! ـــ یعنی مجھے!! افوہ! گستاخی کی حد ہو گئی۔ بیس برس سے افسری کی بھاڑ جھونک رہا ہوں بس اب میں کچھ سُننا نہیں چاہتا۔ صرف تجھے مزہ چکھانا چاہتا ہوں۔ "ورنہ"

ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اس طرح میرے روبرو "ورنہ" کہہ دیا کرے گا، یہ یہ ایک روایت بن جائے گی۔ ایک ذلیل رسم پڑ جائے گی۔ ایک مستقل تحریک کی شکل اختیار کرے گی۔ اس کا فوری تدارک کیا جانا چاہیئے۔

"اے چپڑاسی"۔

(آواز کے ساتھ دو آدمی اندر داخل ہوتے ہیں۔ صاحب گرجتے ہیں)

صاحب:- اس بدتمیز گستاخ کو دھکے مار کر دفتر سے باہر نکال دو۔

(دونوں دھکے مارتے ہوئے آدم خاں کو دفتر سے باہر نکال دیتے ہیں۔ اور پردہ گر جاتا ہے۔)

منظر سوم

دفتر کے پھاٹک سے آگے فٹ پاتھ پر روزگار خاں سے ملنے آئے ہوئے بہت سے لوگوں کا ہجوم ہے جو آدم خاں کے اس حسرتناک انجام پر زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے۔ ان میں سے ایک وحشتناک شکل اور میلے کچیلے اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص آدم خاں کے قریب پہنچتا ہے۔ آدم خاں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں تو وہ اجنبی اور غمگسار آدم خاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ شعر پڑھتا ہے ؎

اجنبی غمگسار:- نہ رو ہمنشیں یہ جہاں اور ہے
یہاں کی رہِ امتحاں اور ہے

اچھا لو یہ سگریٹ پیو۔

(آدم خاں اس اجنبی غمگسار کی اس ہمدردی سے بہت متاثر ہوا اور اس کا پیش کردہ آدھا بجھا ہوا سگریٹ منہ میں لگا کر جلاتا ہے اور کہتا ہے)۔

آدم خاں: میرے اجنبی غمگسار مجھے اس کا زیادہ دُکھ نہیں کہ صاحب نے مجھے روزگار خاں سے کیوں نہیں ملایا۔ بلکہ مجھے اس کا غم ہے کہ اس نے مجھے دھکے مار کر کیوں نکلوا دیا۔

اجنبی غمگسار: ہمنشیں۔ تمہاری یہ شکایت بے جا ہے۔ اس میں صاحب کا کیا قصور ہے۔ اُس نے اپنا سرکاری فرض انجام دیا ہے جس کی اُسے تنخواہ ملتی ہے۔

آدم خاں:۔ (حیران ہو کر) میرے اجنبی غمگسار۔ یہ تم کیا بک رہے ہو؟

اجنبی غمگسار:۔ (مسکراہٹ کو جاری رکھتے ہوئے)

ہم نشیں یہ میں نہیں بک رہا ہوں بلکہ تم بک رہے ہو جنوں میں کیا کیا کچھ؟ وہ دیکھو سامنے دیوار پر کسی منچلے نے کیا لکھا ہے۔

آدم خاں:۔ (بہ آواز بلند پڑھتا ہے) دھکے دلانے والا دفتر۔

اس کے بعد آدم خاں ناک پونچھنے کے لیے جیب سے رومال نکالتا ہے تو ساتھ ہی اس کی جیب کے چار روپے بھی باہر آ جاتے ہیں جن کو دیکھ کر اجنبی غمگسار کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آتی ہے۔ اور وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہتا ہے۔

اجنبی غمگسار:۔ ان روپوں کو سنبھال کر رکھو۔ بہت سے ایسے بزرگ بھی ادھر گھومتے پھرتے ہیں جو ہاتھ کی صفائی میں ماہر ہیں۔

آدم خاں:۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے روپے اچھی طرح جیب میں رکھ لیتا ہے اور اس سے اجازت طلب کرتا ہے تو اجنبی غمگسار کہتا ہے۔

اجنبی غمگسار:۔ یار پتہ نہیں پھر کبھی اس شہر میں ہماری تمہاری ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اس مختصر ترین

دوستی کو یاد رکھنے کے لئے بچھڑنے سے پہلے ایک دوسرے سے گلے تو مل لیں۔

آدم خاں۔ ہاں ہاں کیوں نہیں دوست۔ آؤ۔

(دونوں بڑی گرمجوشی سے گلے ملتے ہیں۔ اس وقت اجنبی غمگسار کا چہرہ ناظرین کی طرف ہوتا ہے اور وہ بڑی شرارت آمیز انداز میں ناظرین کو آنکھ مارتا ہے اور اس وقت پردہ گر جاتا ہے)۔

منظر چہارم

(ایک تھرڈ کلاس ہوٹل کا اندرونی حصہ، ہوٹل بھرا ہوا ہے۔ لوگ بیٹھے ہوئے چائے پی رہے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں۔ بیرے شور مچا رہے ہیں۔

کالا ٹوپی والا .... بارہ آنے

لال کوٹ والا .... سوا روپیہ

دھاری دار قمیض .... تین آنے

صاحب کا بھیجا لاؤ۔

ایک پونا — ایک گلاس برف پانی۔

ایک میز پر آدم خاں بیٹھا دانتوں میں خلال کر رہا ہے۔ اس کے سامنے تین چار خالی پلیٹیں پڑی ہیں — اور وہ ایک لمبی ڈکار لے کر بیرے سے کہتا ہے۔

آدم خاں:۔ ایک پاکٹ کنگ اسٹارک سگریٹ اور ایک پونا چائے!!

(بیرا جس وقت کنگ اسٹارک کا پیکٹ اور چائے اس کی میز پر رکھتا ہے اس وقت ایک مکروہ شکل غلیظ بوڑھی عورت ہوٹل میں داخل ہوتی ہے۔ اور آدم خاں

کی میز پر بالکل اس کے بالمقابل بیٹھ جاتی ہے۔ آدم خاں اس اجنبی بوڑھیا کو دیکھ کر کچھ جز بز ہوتا ہے تو بوڑھیا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتی ہے۔ اس پر آدم خاں حیران ہو کر اُس سے پوچھتا ہے۔

آدم خاں:۔ محترم خاتون۔ آپ کون ہیں اور مجھے دیکھ کر اس طرح کیوں مسکرا رہی ہو؟

بوڑھی عورت:۔ اے لو۔ تم مجھے جانتے ہی نہیں۔ مجھے تو ساری دنیا جانتی ہے۔ میرا نام مصیبت بی بی ہے۔

(آدم خاں یہ سُن کر پریشان ہو جاتا ہے اور پیالی سے چائے پینے کے بجائے طشتری میں چائے انڈیل کر جلدی جلدی پیتا ہے اور چائے ختم کر کے فوراً اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) بڑھیا پوچھتی ہے۔

مصیبت بی بی:۔ بس چل دیئے ۔۔۔؟ مجھ سے اتنی بے رُخی برت رہے ہو۔ دیکھو پچھتاؤ گے۔

آدم خاں:۔ (پریشانی کے لہجے میں) جی۔ بے رخی کی کوئی بات نہیں مجھے ذرا بہت ضروری کام ہے (وہ سیدھا کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہوتا ہے) اور بیرا پیچھے سے آواز دیتا ہے۔)

بیرہ:۔ نیلا بش شرٹ ایک روپیہ پانچ آنے۔

(اس وقت مصیبت بی بی اُٹھ کر آدم خاں کے پاس پہنچ جاتی ہے اور آدم خاں اپنی جیبیں ٹٹولتا ہے۔ تو صرف بارہ آنے نکلتے ہیں اور باقی روپے غائب وہ بار بار جیبیں ٹٹولتا ہے۔ اس پر مصیبت بی بی قہقہہ مار کر ہنس پڑتی ہے اور آدم خاں عاجزی سے ہوٹل کے سیٹھ سے کہتا ہے۔)

آدم خاں:۔ سیٹھ صاحب! ایک بدمعاش نے زبردستی گلے مِل کر میری جیب سے چار روپے

اُڑا لئے ہیں۔ خدا کی قسم میری جیب میں پورے پانچ روپے تھے۔

سیٹھ:۔ (بے مروّتی سے) اڑے جاؤ اڑے جاؤ۔ سب سالا ایسا ہی ایکٹنگ کرتا ہے ہمارا پورا ایک روپیہ پانچ آنہ ادھر رکھو۔

آدم خاں:۔ (عاجزی سے) سیٹھ صاحب میں جھوٹ نہیں بولتا ہیں ایک شریف اور تعلیم یافتہ آدمی ہوں۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ یہ بارہ آنے تو لے لو۔ باقی نو آنے میں شام تک ضرور کسی نہ کسی طرح تمہیں لا دوں گا۔

سیٹھ:۔ نہیں رے نہیں۔ نو آنے کے بدلے اپنا فاؤنٹین پن اِدھر رکھ جاؤ۔ جب نو آنے لاؤگے تو پھر لے جانا۔

(آدم خاں چپ چاپ فاؤنٹین پن سیٹھ کے حوالے کر دیتا ہے اور ہوٹل سے باہر نکلتا ہے تو مصیبت بی بی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے)۔

مصیبت بی بی:۔ دیکھ لیا تم نے مجھ سے بے رُخی برتنے کا انجام۔ ابھی تو کچھ نہیں ہوا ابھی اور ہوگا۔ میں اپنا بدلہ لوں گی۔ سایہ کی طرح تم سے ہمیشہ چمٹی رہوں گی۔

(آدم خاں کندھا جھٹکا کر آگے چلا جاتا ہے اور پردہ گرتا ہے)۔

منظر پنجم

پردہ اٹھتا ہے۔

اللہ کی رحمت کا پاکستانی ہوٹل کمرہ ۱۷ کا اندرونی منظر۔ ایک چھوٹی میز ایک کرسی ایک چارپائی۔ آدم خاں چارپائی سے نیچے پاؤں لٹکائے بیٹھا سگریٹ پیتا ہوا کچھ سوچ رہا ہے۔ اچانک ایک خوفناک شکل والا نوجوان کمرے میں

داخل ہوتا ہے اور پُوچھتا ہے۔

خوفناک شکل والا نوجوان :۔ "تمہارا ہی نام آدم خاں ہے؟

آدم خاں :۔ (حیرانی کے عالم میں اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے) جی ہاں فرمایئے آپ کو مجھ سے کیا کام ہے اور آپ کون ہیں؟

خوفناک شکل والا نوجوان : میرا نام بخار خاں ہے مجھ سے ساری دنیا ڈرتی ہے ۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے آج میری محبوبہ بی مفلسی بیگم کی والدہ مصیبت بی بی کی بے عزّتی کی ہے؟

آدم خاں :۔ (خوف سے کانپتے ہوئے) جی نہیں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

بخار خاں :۔ (آدم خاں کے گال پر ایک زور کا چانٹا مارتے ہوئے) غلط فہمی کا بچّہ! تم نہیں جانتا کہ ہم اپنی محبوبہ مفلسی بیگم سے کتنا پیار کرتا ہے۔ تمہاری یہ جرأت کہ تم میری محبوبہ کی ماں کی بے عزّتی کرو۔

(یہ کہہ کر بخار خاں آدم خاں پر حملہ آور ہوتا ہے اور اسے بستر پر گرا کر اتنا مارتا ہے کہ آدم خاں بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اور بخار خاں اسے گالیاں دیتا ہوا باہر چلا جاتا ہے ۔۔۔ اور پردہ گر جاتا ہے)۔

منظر ششم

رہی اللہ کی رحمت کا پاکستانی ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۲ کا اندرونی حصّہ آدم خاں چارپائی پر بے ہوش پڑا ہے اور ساس کی چارپائی پر مصیبت بی بی بیٹھی ہوئی ہے۔ اور کھڑکی کے پاس بخار خاں کھڑا ہے اور دو نوجوان خوبرو عورتیں ہیں۔ ایک کرسی پر بیٹھی ہے اور ایک میز پر ٹک گئی، تھوڑی دیر بعد آدم خاں

کراہتا ہوا آنکھیں کھولتا ہے اور اتنے لوگوں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ مصیبت بی بی اور نجار خاں کو تو وہ پہچان لیتا ہے لیکن وہ دو نوجوان خوبرو عورتیں کون ہیں؟ وہ براہِ راست ان سے پوچھتا ہے۔

"معاف کیجیے، آپ دونوں معزز خواتین کی تعریف؟"

ایک خاتون جو کالی ساڑھی اور کالے بلاؤز میں ملبوس ہے بصد عشوہ و ادا شرما کر کہتی ہے۔

"جی میرا نام آنسہ بیروزگاری خانم ہے۔"

دوسری خاتون۔ جو گہرے اودے رنگ کی شلوار اور قمیض میں ملبوس ہے نظروں کے تیر چلا کر کہتی ہے۔

"اور مجھے بی مفلسی بیگم کہتے ہیں۔"

یہ تعارف سن کر آدم خاں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور وہ بڑی مشکل سے بولتا ہے۔

آدم خاں:۔ ایک مشہور و معروف خاندان کے ان شہرہ آفاق ہستیوں سے مل کر مجھے بڑی مسرت ہوئی لیکن خدارا مجھ پر رحم کھائیے، میرا پیچھا چھوڑیئے، یہاں سے چلے جائیے ورنہ میں زندہ نہ بچ سکوں گا۔

(بی مفلسی خانم ٹھنک کر بڑے ناز و غمزے کے ساتھ اپنے گال پر انگلی رکھ کر کہتی ہے)

بی مفلسی خانم:۔ اے واہ ہم کیسے چلے جائیں۔ ہم تو اپنی اماں کے ساتھ آئے ہیں۔ کیوں اماں جان؟

مصیبت بی بی:۔ ہاں بیٹی۔

بی مفلسی خانم :- کیا آپ ہماری اماں مصیبت بی بی سے واقف نہیں۔ یہ بیچاری آپ کو بہت چاہتی ہیں کیونکہ اس ملک میں آپ بالکل اکیلے ہیں اور آپ کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

آدم خاں :- معزز خاتون۔ آپ کی اماں جان یہاں تشریف لے آئیں یہی کیا کم ہے جو آپ لوگوں نے بھی زحمت فرمائی۔

بیروزگاری خانم :- اوئی اللہ! آپ تو بڑے بھولے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ہماری اماں کہیں بھی اکیلی نہیں جاتیں۔ کیا آپ نے اپنے بزرگوں سے کبھی یہ کہتے نہیں سُنا کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔

آدم خاں نے یہ سُن کر سر پر دو ہتڑ مارے، سر کے بال نوچے اور ایک لمبی ٹھنڈی سانس لے کر بولا :-

"ہائے ری قسمت"

اس پر مصیبت بی بی چارپائی پر اور کھسک کر آدم خاں کے قریب ہو گئیں اور بولیں۔

مصیبت بی بی :- بیٹا اب افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ نوجوان آدمی ہو، ذرا میری بٹیا کی طرف تو دیکھو کتنی نوجوان ہے خوبصورت ہے — بس پری ہے پری — بیاہ رچالو! اور عیش کرو۔

آدم خاں نے ایک نظر بی مفلسی بیگم اور دوسری نظر آنسہ بیروزگاری خانم پر ڈالی اور گھبرا کر بولا۔

آدم خاں :- مگر محترمہ۔ میں تو شادی شدہ ہوں وہاں پردیس میں میری ایک بیوی بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے کہ کب میں اُسے یہاں بلاؤں اور کب وہ آئے ا ۱۱/۱۶ وجسم

کو شاد کرے۔

معصیبت بی بی :۔ بیٹا! اب اس منکوحہ بیوی کو بھول جاؤ۔ وہ اب تمہارے پاس آنے سے رہی۔ اگر آ بھی آجائے تو کوئی ہرج نہیں۔ ہر مسلمان چار شادیاں کر سکتا ہے۔ اور کرتا ہی ہے مجھے کوئی ایسا مسلمان دکھا دو جس کی چار بیویاں نہ ہوں! ایک تو نکاحی بیوی ہوتی ہے، دوسری بے روزگاری، تیسری مفلسی اور چوتھی بیماری۔

(یہ بات سُن کر آدم خاں نے یوں محسوس کیا جیسے اُس کی چار پائی جادو کی چار پائی ہے جو فضاؤں میں اُڑ رہی ہے۔ پتہ نہیں اُسے کیا سُوجھی اچانک بستر سے چھلانگ لگائی، جلدی جلدی بستر لپیٹا اور ٹرنک اُٹھا کر کمرے سے باہر دوڑا، اور اس کے پیچھے تینوں چڑیلیں اور بخار خاں دوڑے۔ پردہ گر جاتا ہے)۔

منظر ہفتم

ہوٹل کا بڑا دروازہ۔ آدم خاں کو ہوٹل کے سیٹھ نے روک رکھا ہے۔ آدم خاں سیٹھ سے گڑگڑا رہا ہے۔

آدم خاں :۔ سیٹھ صاحب اس وقت تو مجھے خدا کے لئے جانے دو۔ دو دن کے کرائے کی کیا بات ہے، جب کہ میں پچھلے پندرہ روز تک آپ کی ہوٹل میں ہر روز کرایہ ادا کرتا رہا۔ صرف مجھے چند دن کی مہلت دیجئے میں پائی پائی چکا دوں گا۔ اس وقت خدا کے لئے مجھے ان چڑیلوں سے چھٹکارا دلایئے۔

سیٹھ :۔ نہیں نہیں ہم کچھ نہیں جانتا۔ کرایہ رکھو، ورنہ سامان چھوڑ جاؤ۔ جب کرایہ لاؤ گے تب سامان لے جانا۔

ناچار آدم خاں اپنا سامان اُتار دیتا ہے اور سیٹھ نوکر کو آواز دیتا ہے۔

سیٹھ:۔ ارے عبدل ۷ا نمبر کا سامان گودام میں ڈال دو۔

یہ سُن کر تینوں چڑیلیں اور بخار خاں زور زور سے قہقہہ لگانے لگے۔

(پردہ گر جاتا ہے)

منظر ہشتم

آدم خاں اُداس اور تھکے تھکے قدموں سے سڑک پر چلنے لگا لیکن بڑی الجھن میں مبتلا تھا کیونکہ مصیبت بی بی، آنسہ بے روزگاری خانم اور بی مفلسی بیگم بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ صرف بخار خاں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے آدم خاں نے ایک زوردار چیخ ماری اور پلٹ کر مصیبت بی بی کے قدموں میں اوندھے مُنہ گر پڑتا ہے اور ایک ہاتھ سے بیروزگاری خانم اور دوسرے ہاتھ سے بی مفلسی بیگم کی پنڈلیاں پکڑ لیں اور گڑگڑانے لگا۔

"اے خاندانِ بلائے بے درماں! خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ
میں واللہ مر جاؤں گا۔"

لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آنسہ بے روزگاری خانم بولیں۔

"ہے ہے ـــــ ہم تمہیں کیسے چھوڑ دیں۔ تم ہمارے ملک میں اکیلے ہو یہاں تمہارا کوئی نہیں۔ یہ ہماری مہمان نوازی کی توہین ہو گی اگر ہم تمہیں اس طرح سے اکیلا چھوڑ دیں۔

... اس طرح دیکھا جیسے کوئی محبوبہ اپنے محبوب

کو دیکھتی ہے اور پھر سامنے والے ہوٹل میں گئی اور ہوٹل کے ریڈیو سے فلمسٹار ثریا کی زبان مستعار لے کر گانے لگی۔

دل دھڑکے آنکھ موری پھڑکے
چلے جانا نہ دیکھو جی بچھڑ کے

آدم خاں نے عاجز آکر ہتھیار ڈال دیئے۔ اور بولا :-

"اچھا تو لو — جو ہوگا دیکھا جائے گا"

آدم خاں ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جیسے وہ بھی اسی خاندان کا ایک فرد ہے۔ راستے میں ایک جگہ بہت بھیڑ تھی۔ آدم خاں نے چٹکی بجا کر سر ہلایا جیسے اس کو کوئی انوکھی ترکیب سمجھ میں آئی ہو۔ سامنے سے ایک بڑا مالدار آدمی چلا آرہا ہے آدم خاں تیز تیز چلنے لگا اور اس سے اس زور سے ٹکرایا کہ دونوں گر پڑے۔ اور اسی دوران میں آدم خاں نے اس کے کوٹ کی جیب سے مبلغ ۲۵ روپے اڑا لیے، لیکن اس آدمی کو پتہ نہ چل سکا۔ آدمی نے اٹھ کر کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔

امیر آدمی :- اندھا ہے، دیکھ کے نہیں چلتا۔ بلڈی فول ایڈیٹ —!

آدم خاں :- (اٹھتے ہوئے) آئی ایم سوساری جنٹلمین۔

منظر نہم

امیر آدمی کی جیب سے اڑائے ہوئے روپوں سے آدم خاں نے ایک جھونپڑی کے لئے ٹاٹ بانس اور چھپر خریدا تھا۔ اور لالو کھیت میں ایک جھونپڑی ڈال کر آنسہ بے روزگاری خانم، بی مفلسی بیگم اور مصیبت بی بی کے ساتھ کھپت ہوگیا

تھا پردہ اُٹھتا ہے تو دکھائی دیتا ہے کہ آدم خاں اور تینوں چڑیلیں بیٹھی تاش کھیل رہی ہیں جھونپڑی کے باہر سے آواز آتی ہے۔

ڈاکیہ :- چھٹی لے جاؤ :-

آدم خاں اُٹھتا ہے باہر جاتا ہے اور ایک چھٹی لے کر اندر آتا ہے اور پڑھ کر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اُداس ہو جاتا ہے تو بی مفلسی خانم بصد شوخی پوچھتی ہے۔

بی مفلسی خانم :- کیا بات ہے! کیوں اُداس ہو گئے منحوس؟

آدم خاں :- (چھٹی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے) لو یہ چھٹی خود بھی پڑھو اور اپنی پیاری اماں جان اور دُلاری آپا جان کو بھی سناؤ۔ تاکہ تم لوگوں کے کلیجوں میں ٹھنڈک پڑے۔

بی مفلسی خانم چھٹی اس کے ہاتھ سے لے کر بہ آواز بلند پڑھتی ہے۔

از شہر گلبرگہ شریف

مورخہ ۱۲ر۔ نومبر ۱۹۴۷ء

جناب آدم خاں صاحب!

آپ حیران ہوں گے کہ میں نے آپ کو میرے پیارے آدم! میرے من مندر کے راجہ! یا میرے سرتاج وغیرہ جیسے القاب سے کیوں یاد نہیں کیا۔ اس کی وجہ آپ کے کرتوت ہیں آپ نے یہاں سے جاتے وقت وعدہ کیا تھا کہ وہاں پہنچ کر آپ ہمیں جلد ہی بلالیں گے لیکن کل ہم سے پیاری بیگم کا لڑکا چاند پاشا ملا تھا۔ وہ چھ دن پہلے پاکستان سے یہاں آیا ہے۔ اس نے ہمیں آپ کے ساری کرتوت کا حال بتایا ہے، اُس نے بتایا کہ آپ نے تین آوارہ عورتوں

کو اپنے گھر ڈال لیا ہے اور مجھ سے غافل ہو گئے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر مجھے بھی آپ سے غافل سمجھ لیجئے۔ اور مجھے طلاق دے دیجئے۔ اس خط کے ہمراہ اپنا خلع نامہ بھیج رہی ہوں۔ اس کے بعد نہ میں آپ کی بیوی اور نہ آپ میرے شوہر ـــ آخری بار خدا حافظ۔

آپ کی سابق بیوی

حوّا بی بی بقلم خود

خط سن کر آنسہ بیروزگاری خانم خوشی سے اچھل پڑیں اور پکارا۔

آنسہ بیروزگاری خانم:۔ وہ مارا۔

یہ کہہ کر وہ اپنی پیاری اماں جان مصیبت بی بی کے گلے سے چمٹ کر جھول گئیں لیکن مصیبت بی بی نے آدم خاں کو روتا دیکھ کر کہا۔

مصیبت بی بی:۔ ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا!

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

آدم خاں نے نظر اٹھا کر جو دیکھا تو جھونپڑی میں دو پولیس کے سپاہی اور دفتری بابو بغل میں فائل دبائے کھڑے ہیں۔ آدم خاں اُٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا۔

آدم خاں:۔ آپ لوگوں نے کیسے تکلیف فرمائی۔ کیا اور کوئی کسر باقی رہ گئی ہے جو آپ پوری کرنے آئے ہیں؟

دفتری بابو:۔ بغیر اجازت سرکاری زمین پر تم نے یہ جھونپڑی کس طرح ڈالی ہے؟

آدم خاں:۔ (مسخرے پن سے) جی بس ایسے ہی ڈال لی جس طرح ڈالتے ہیں یعنی پہلے بانس کھڑے کئے۔ اُن پر ٹاٹ لگایا اور پھر اس پر چھپّر ڈال دیا۔ بس

دفتری بابو غصہ سے پیر پٹک کر پولیس کے سپاہیوں سے کہتا ہے "یہ جھونپڑی فوراً اکھیڑ پھینکو۔" سپاہی پہلے آدم خاں، آنسہ بے روزگاری خانم، بی مفلسی بیگم اور مصیبت بی بی کو پکڑ پکڑ جھونپڑی سے باہر ڈھکیلتے ہیں اور پردہ گر جاتا ہے)

منظر دہم

رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ آدم خاں آنسہ بیروزگاری خانم، بی مفلسی بیگم، اور مصیبت بی بی پبلک گارڈن کی ایک روش پر بیٹھے ہیں اچانک ایک پولیس انسپکٹر اور چار پانچ سپاہی وہاں پہنچتے ہیں۔ ایک سپاہی پوچھتا ہے۔

پولیس :۔ اے تم ان آوارہ عورتوں کے ساتھ یہاں کیا کر رہے ہو؟

آدم خاں :۔ حضور! میں بے روزگار......

انسپکٹر :۔ بیروزگار کا بچہ! سپاہیو۔ ان سب کو تھانے لے چلو آوارہ عورتیں اور غنڈہ بدمعاش!

منظر آخری

عدالت ــــ ایک کٹہرے میں آدم خاں کھڑا ہے اور دوسرے کٹہرے میں آنسہ بے روزگاری خانم، بی مفلسی بیگم اور مصیبت بی بی کھڑی ہیں ــــ جج صاحب فیصلہ سنا رہے ہیں۔

"ملزم مسمی آدم خاں پبلک گارڈن جیسے عام مقام پر تین آوارہ عورتوں مسماۃ بیروزگاری بیگم مسماۃ مفلسی بیگم اور مسماۃ مصیبت بی بی کے ساتھ

برسرِعام ناشائستہ حرکات یعنی بوس و کنار میں رنگے ہوئے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ اس لئے عدالتِ ہذا ملزم آدم خاں کو غنڈہ قرار دیکر غنڈہ ایکٹ کی دفعہ فلاں فلاں کے تحت چھ ماہ قیدِ بامشقت کی سزا سُناتی ہے۔ اور تینوں خواتین کو باعزت طور پر بری کیا جاتا ہے۔"

حکمنامہ میرے دستخط اور عدالت کے مہر سے جاری ہوا

آدم خاں: حضور میں کچھ عرض کر سکتا ہوں؟

جج:۔ اجازت ہے!

آدم خاں:۔ میں حضور فیض گنجور کی اس عدل گستری کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے اس فیصلہ کو سن کر بڑی خوشی ہوئی اور خوشی اس لئے کہ کم از کم چھ مہینے کے لئے ہی سہی ان تینوں چڑیلوں سے تو میرا پیچھا چھوٹ جائے گا۔

آنسہ بیروزگاری خانم، مفلسی بیگم اور مصیبت بی بی اچانک چیخ چیخ کر رونے لگتی ہے اور آدم خاں ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے۔

(پردہ تیزی سے گر جاتا ہے)

نیستی اور برخورداری

میرا ایک دوست ہے وہ اگر نوجوان نہیں ہے تو کم از کم جوان ضرور ہے۔ اس کی عمر ۳۰۔۳۲ سال ہے وہ ہندوستان کی مشہور درسگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ذہین اور فرسٹ کلاس گریجویٹ ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں وہ ایک خوشحال گھرانے کا بڑا بے فکر بیحد صحت مند ہنسوڑا، کھلنڈرا اور خوش پوش لڑکا تھا۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے تھے۔ پورے دس سال بعد پچھلے دنوں اچانک کراچی میں میری اس سے ملاقات ہو گئی پہلی نظر میں تو میں اُسے پہچان ہی نہیں سکا۔ بہت غور سے دیکھنے کے بعد جب میں نے اُسے پہچان لیا تو حیران رہ گیا۔ اور اب تک استعجاب کے عالم میں یہ سوچتا رہتا ہوں کہ میرے دوست کے جسم سے آخر وہ دوست کدھر نکل کر فرار ہو گیا جو ایک خوشحال گھرانے کا بے فکرا، ہنسوڑا، کھلنڈرا، صحت مند اور خوش پوش لڑکا تھا۔

یونیورسٹی کا ذہین اور فرسٹ کلاس طالب علم تھا۔ جو بات بات پر بے فکر

زندگی کے بھرپور قہقہے لگاتا تھا۔ سچ مچ یہ کتنی حیرانی کی بات ہے کہ وہی دوست ۳۰ ۳۲ سال کی عمر میں ۴۰۔ ۴۵ سال کا بوڑھا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خوش پوشاکی ایک میلی قمیض اور گھسی ہوئی پتلون میں دفن ہو چکی ہے۔ اس کے بارے میں سب کو یقین تھا کہ وہ یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد زندگی کے بڑے اہم عہدے پر فائز ہوگا لیکن اب وہ ایک کلرک ہے جس کی تنخواہ ایک سو چالیس روپیہ ماہوار ہے۔ اسکی صحت بے حد خراب ہو چکی ہے۔ کہاں وہ بات بات پر بھرپور قہقہے لگانے والا دلدار نوجوان اور کہاں یہ جُھلسے ہوئے چہرے والا جوان بوڑھا جو اپنے ایک، گہرے دوست سے ایک طویل عرصے کے بعد ملنے پر ایسی سکڑی ہوئی مسکراہٹ سے خوشی کا اظہار کر رہا ہے جیسے مُسکرا نہیں رہا بلکہ سِسک رہا ہے۔ میں نے اس کی اس افسوسناک تبدیلی پر بڑی دیر تک بات چیت کی اور مجھے معلوم ہوا کہ اس کی اس حسرتناک زندگی کا سبب نہ تو ایک سو چالیس روپیہ ماہوار کی کلرکی ہے اور نہ اس کی قسمت کی خرابی ــــ

بلکہ اس کی وجہ آٹھ بچّے ہیں۔

میرے دوست نے یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد شادی کر لی اور اس کے بعد سے وہ ہر سال ایک بچّے کا باپ بننے لگا۔ پچھلے دس سال میں اس کے ہاں دس بچے پیدا ہوئے جن میں سے دو اسقاط حمل کے باعث ضائع ہو گئے۔ باقی آٹھ ماشاءاللہ زندہ ہیں اور اس سال بیوی پھر اُمید سے ہے، محلے والے دوست، احباب، عزیز رشتہ دار بالخصوص اس کی بیوی کی سہیلیاں اسے بڑا "صاحبِ نصیب" آدمی سمجھتی ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اُسے گھر بھر کے بچّے دیئے ہیں کیونکہ سے

نعمت کوئی دُنیا میں پسر سے نہیں بڑھ کر
راحت کوئی آرامِ جگر سے نہیں بڑھ کر

لیکن اس صاحبِ نصیب سے پوچھئے تو وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیتا ہے۔

"یار کچھ نہ پوچھو۔ جی چاہتا ہے کہ اپنی زرخیز بیوی اور اس شیطانی غول کا گلا گھونٹ کر رکھ دوں۔ ہر سال ایک نئی مصیبت گلے کا ہار ہوتی جارہی ہے۔ میں نہ اُن کی پرورش کر سکتا ہوں اور نہ انہیں ایک اچھا مستقبل دے سکتا ہوں!"

میں نے اُسے مشورہ دیا:-

"تم ضبطِ تولید کرو۔ آخر پڑھے لکھے آدمی ہو۔ جانتے بوجھتے......

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سرگوشی کی آواز نکالتے ہوئے میری بات کاٹی۔

"خاموش ذرا دھیرے سے بولو۔ کہیں میری بیوی یا والدہ نہ سُن لے۔ وہ لوگ بڑے قدامت پسند ہیں!"

اس کے بعد میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا اور کیسے پُوچھ سکتا جب کہ اپنا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ دس سال میں سات بچے پیدا کر کے دوسروں کو ضبطِ تولید کا مشورہ دینا بالکل "خودرا فضیحت و دیگراں رانصیحت" والی بات ہے۔

ایک میرا کلرک دوست اور دوسرے میں خود ہی کیا اپنے پیارے وطن پاکستان میں بچے پیدا کرنے کا "فرض" عام ہے۔ چلئے اگر اسے فرض سمجھنے میں آپ کو کوئی تامل ہو تو اُسے عادت سمجھ لیجئے۔ اس حقیقت سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے کہ اپنے پیارے وطن کے پیارے غریب باشندوں کی سب سے بڑی عادت صرف بچے پیدا کرنا ہے۔

کوئی شخص میرے اس دعوے کو نہیں جھٹلا سکتا کہ پاکستانی فرد شعوری طور پر بچے نہیں پیدا کرتے ہیں، بلکہ وہ نام پیدا کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرنے سے قبل وہ کبھی یہ شعوری

طور پر بھی نہیں سوچتے کہ ہمیں نسل انسانی کی افزائش کرنی ہے۔ یا اپنی قوم کو زیادہ سے زیادہ افراد دینے ہیں۔ یا ایسا بچہ یا بچی پیدا کرنا ہے جو نہ صرف ماں باپ کا نام روشن کریگا بلکہ اپنے وطن اپنی قوم، ساری انسانیت اور ساری دنیا کی خدمت کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی شخص میرے اس دعوے کو جھٹلا نہیں سکتا۔ اس کے برعکس بڑا شرماتے ہوئے صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ

"یار ۔۔ میں تو ہمیشہ خالی الذہن یہ تخلیقی کام انجام دیتا رہا ہوں "

میں قطعاً یہ نہیں کہتا کہ زیادہ بچے پیدا کرنا کوئی لعنت یا نحوست ہے ہر انسان کو بلاشبہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنا چاہیئے۔ لیکن اس سے پہلے اس کو یہ ضرور دیکھنا چاہیئے کہ اس ملک کی اقتصادی حالت یا اس کی قوم کا سیاسی نظام کیا ہے۔ کیونکہ بچوں کی پیدائش کا اس ملک کی معاشی حالت سے بڑا گہرا اور مضبوط رشتہ ہوتا ہے مثلاً اسی دنیا کی زمین پر بعض ایسے ملک بھی ہیں جہاں زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر حکومتوں کی طرف سے والدین کو انعام واکرام ملتا ہے اخباروں اور ریڈیو کے ذریعہ ان کا شہرہ سارے ملک میں کیا جاتا ہے ان کی تصویریں اخباروں اور کتابوں میں شائع کی جاتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اسی زمین پر ایسے بھی ملک ہیں جہاں زیادہ بچے پیدا کرنے والے والدین ہمیشہ رونی صورت بنائے منحوسوں کی طرح گھومتے پھرتے رہتے ہیں یا پھر چھت سے رسّی کا پھندا لٹکا کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا پھر ریل کے نیچے کٹ کر جان دیتے ہیں۔

جن ملکوں میں زیادہ بچے پیدا کرنے پر والدین کو انعام واکرام، عزت وتوقیر ملتی ہے ان ملکوں میں بچے افزائش نسل اور ملک وقوم کی خاطر پیدا کیے جاتے ہیں لیکن جن ملکوں میں کثرتِ اولاد والدین کی حرام موت کا باعث ہوتی ہے ان ملکوں میں بچے صرف

اس لئے پیدا کئے جاتے ہیں کہ یہ ایک "تفریح" ہے۔ تفریح کی تشریح یہ ہے کہ ان ملکوں کے عوام بالعموم بہت غریب ہوتے ہیں۔ دن بھر جان توڑ محنت کرنے کے بعد خالی جیب جب وہ گھر جاتے ہیں تو اپنی تھکن اُتارنے کے لئے نہ تو وہ کسی پبلک گارڈن میں جا سکتے ہیں (کیونکہ سپاہی انہیں دفعہ ۱۰۹ آوارہ گردی کے جرم میں گرفتار کر لیتے ہیں) نہ وہ کسی کلب، تھیٹر، سینما یا ریسٹوران میں داخل ہو سکتے ہیں (کیونکہ اس کے لئے داخلہ ٹکٹ کے پیسے نہیں ہوتے) لے دے کے صرف "بستر" ہی ان کی واحد تفریح گاہ ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنی تھکن وہیں اتارتے ہیں۔ اور پھر نو دس مہینے بعد اسی بستر پر ان کی تھکن چیخ پکار کرنا شروع کرتی ہے۔ اور پھر آپ کو مستقل رُلاتی رہتی ہے۔

اپنے پیارے وطن کے خوبصورت شہروں کے غلیظ راستوں پر آپ کو گندے بچّوں کے جو غول کے غول نظر آتے ہیں اور جو ہر روز کسی نہ کسی موٹر گاڑی کے نیچے اور آسمان کے اوپر جاتے رہنے کے بعد بھی کم نہیں ہوتے وہ سب تفریح اور تھکن کی پیداوار ہیں۔ پیدا ہونے کے بعد وہ صرف وہ آپ کی مفلسی بلکہ اپنے وطن کی مفلسی میں اضافہ کرتے ہیں اور جب یہ بچّے ملک پر ایک مفلسی کی فضا طاری کر دیتے ہیں تو پھر آپ اپنے رستموں، اپنے سہرابوں، اپنے فردوسیوں، اپنے نپولینوں کو نہ رستم بنا سکتے ہیں اور نہ سہراب آپ کے مستقبل کا فردوسی کسی ہوٹل کا بیرہ ہو کر جھوٹے برتن دھوتا رہتا ہے اور آپ کے مستقبل کا نپولین کسی برٹش کے میدان جنگ میں اترنے کے بجائے بندر روڈ پر رکشا چلاتا ہے یا موچی گیٹ سے لوہاری گیٹ کے درمیان لخ لخ کرتے آوازیں لگاتا ہے۔

"ایک سواری ریل تے!"

"دو سواری مکلوڈ تے!"

اگر ہم موجودہ زمانے میں بچوّں کی پیدائش کی رفتار کا اندازہ اس پُرانے زمانے میں بچوں کی پیدائش کی رفتار سے کریں جب کہ انسان کی معاشی اور اقتصادی حالت بہت اچھی تھی تو ہمیں معلوم ہوگا کہ موجودہ زمانے میں باپ کم ہوتے ہیں اور بچے زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور پُرانے زمانے میں باپ زیادہ اور بچےّ کم پیدا ہوتے تھے۔ یعنی ایک رستم صرف ایک ہی سہراب پیدا کرتا تھا اس کے برخلاف موجودہ زمانے میں ایک شیخ رستم خاں کئی کئی سہراب پیدا کرتا ہے لیکن ان میں سے بیشتر سہراب بالکل خراب نکلتے ہیں۔

ایک مشہور ماہر معاشیات و اقتصادیات مالتھس کا نظریہ آبادی یہ ہے کہ زیادہ آبادی کے باعث مفلسی اور اقتصادی بدحالی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے مالتھس نے یہ سفارش کی تھی کہ کثرتِ اولاد کو روکنے کے لئے انسانوں کو زیادہ سے زیادہ ضبطِ تولید پر عمل کرنا چاہیئے۔

نظریۂ اشتراکیت کے بانی کارل مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ زیادہ آبادی کوئی خطرناک بات نہیں۔ اگر دنیا کی دولت سارے انسانوں میں برابر اور منصفانہ طریقے پر تقسیم کی جائے۔ کارل مارکس نے کہا کہ زیادہ آبادی کے باعث مفلسی یا اقتصادی بدحالی نہیں پیدا ہوتی بلکہ مفلسی اور اقتصادی بدحالی ان گنتی کے چند انسانوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو سارے انسانوں کی دولت لوٹ کھسوٹ کر اپنے لئے بڑے بڑے حصے محفوظ کر لیتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کو مفلسی اور محرومی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

زیادہ آبادی اور مفلسی سے متعلق ان دونوں نظریات کو پیشِ نظر رکھ کر اگر غور کیا جائے تو ہمیں مالتھس سے زیادہ کارل مارکس کا نظریہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔ اس کا عملی تجربہ بھی آج کل ان ملکوں میں ہو رہا ہے جہاں کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت عملی جامہ پہن چکا ہے جہاں زیادہ سے زیادہ بچےّ پیدا کرنے والے خوش نصیب والدین کو "اسٹالن انعام" یا مافنے تمغ

انعام دیا جاتا ہے۔ اور اُن کے زیادہ بچّوں کی سرکاری نگرانی میں مفت پرورش کی جاتی ہے۔

اب یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اپنے پیارے وطن کے پیارے باشندوں کو اپنی نیستی اور برخورداری سے نجات حاصل کرنے کے لئے آیا مالتھس کے نظریۂ آبادی کو قبول کرنا اور اس کے مشورہ پر عمل کرنا چاہیئے یا پھر کارل مارکس کے مشورہ پر۔ بہرحال اس مسئلے پر اب صرف ان لوگوں کو سوچنا چاہیئے جنہوں نے ابھی تک شادیاں نہیں کی ہیں یا ابھی ہنی مون یا ماہِ عسل منا رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ جب تک ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت بہتر نہیں ہوتی اگر پاکستانی باشندے ضبطِ تولید پر عمل کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ بھلا آپ ہی سوچیے کہ اس سے آخر فائدہ ہی کیا ہے کہ دس سہراب پیدا ہوں اور دس کے دس خراب نکلیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ایک سہراب پیدا ہو اور بڑا ہو کر وہ سہراب ہی بنے۔

آپ اس مسئلہ پر سوچتے رہیے اتنے میں میں ابھی ذرا خیراتی زچگی خانہ کا چکر لگا آؤں۔ جہاں میری بیوی آٹھویں بچّے کی پیدائش کی تیاریاں کر رہی ہے۔

اُوٹ پٹانگ کہانیاں

(قدیم و جدید)

لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِہِمْ عِبْرَۃٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ
(شک نہیں کہ ان قصوں میں عقل والوں کیلئے بڑی عبرت ہے)

دیباچہ

لکھ قلم پہلے حمد اس رب کی

امابعد واضح ہو کہ پرانے زمانے میں بچوں کو اور نئے زمانے میں نوجوانوں کو کہانیاں سننے پڑھنے، کہنے بلکہ لکھنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ اس واسطے فقیر نے اس مضمون میں ایسی ایسی کہانیاں جمع کی ہیں کہ کہانی کی کہانی ہے اور نصیحت کی نصیحت۔ تاکہ پرانے زمانے کے بچے جو اب بوڑھے ہو چکے ہیں اپنا بچپن یاد کریں اور نئے زمانے کے نوجوان اپنے بڑھاپے سے آگاہ رہیں جہاں تک کہانی کے بارے میں فقیر کے علم کا تعلق ہے کہانی ہر دور میں ایک ہی ہوتی ہے جو ہر زمانے

کے دور میں اپنے آپ کو نئے قالب میں دُہراتی ہے۔ صرف عنوانات ماحول اور کردار بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کے مضمون سے بہ آسانی ہو جائے گا۔ سننے کو تو یہ کہانیاں اُوٹ پٹانگ کہانیاں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب

ترجمہ:۔ شک نہیں کہ ان قصّوں میں عقل والوں کے لئے بڑی عبرت ہے

فقیر مصنف، ابراہیم جلیس مرحوم

حکایت نمبر ا

ایک گدھا اور ایک بن مانس دونوں آپس میں بیٹھے ہوئے خدا کی ناشکری کر رہے تھے۔ گدھے کو یہ شکایت تھی کہ ہائے میرے سینگ نہیں اور بن مانس اس سے ناخوش تھا کہ افسوس میں دم سے محروم ہوں۔ چھچھوندر یہ باتیں سُن کر بولی۔

"چپ رہو کم بختو! کفر مت بکو۔ مجھ کو دیکھو۔ سینگ اور دم کے علاوہ میری تو آنکھیں بھی نہیں!"

حاصل:۔ خدا نے ہم کو جس حال میں رکھا ہے قابلِ شکر ہے۔ حریص خوش نہیں رہ سکتا۔

حکایت نمبر ایضاً

پاکستان کی تین سیاسی جماعتوں کے تین اراکین بیٹھے ایک دن خدا کی ناشکری کر رہے تھے ایک سیاسی جماعت کے رکن کو یہ شکایت تھی کہ

"ہائے میرے سر پر کوئی سینگ (لیڈرشپ) نہیں ہے!"

دوسری سیاسی جماعت کا رکن اس سے ناخوش تھا کہ افسوس میں دم (پیچھے چلنے والے عوام) سے محروم ہوں۔

تیسری سیاسی جماعت مسلم لیگ نے یہ سن کر کہا۔ "چپ رہو کم بختو، کفر مت بکو۔ مجھ کو دیکھو کہ میں سینگ اور دم کے علاوہ آنکھوں سے بھی محروم ہوں۔

حاصل:۔ مسلم لیگ نے ہمیں جس حال میں رکھا ہے قابلِ شکر ہے۔ مسلم لیگ تحت کوئی انسان خوش نہیں رہ سکتا۔

حکایت نمبر۲

ایک جھینگر جاڑے کے دنوں میں بھوک کے مارے نیم جان ہو کر شہر کی مکھیوں کے پاس گیا۔ اور بہت عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ میرے کھانے اور رہنے کا بندوبست کر دو۔ تو میں تمہارے بچوں کو گانا اور موسیقی کی تعلیم دوں۔ اس واسطے کہ مجھ کو فنِ موسیقی میں کمال حاصل ہے۔ شہد کی مکھی کے باپ نے جواب دیا کہ ہمارے بچوں کو معاف رکھیے ہم ان کو اپنا ہی ہنر سکھائیں گے۔ ہمارے بچے گانا سیکھ کر ایسی کون سی کمائی کر لیں گے جبکہ آپ جیسا کاملِ فن بھیک مانگتا پھرتا ہے۔

حاصل:۔ وہ ہنر جس سے روزی کمائی جائے ہزار گانوں سے بہتر ہے۔

حکایت نمبر ایضاً

ایک پاکستانی ادیب مفلسی سے نیم جاں ہو کر ایک سرمایہ دار کے پاس گیا۔ اور بہت خودداری کے ساتھ عرض کیا کہ میرے کھانے اور رہنے کا بندوبست کر دو تو اس کے عوض

میں تمہارے بچوں کو ترقی پسند افسانے اور نظمیں لکھنا سکھاؤں گا، اس واسطے کہ مجھ کو علم وفن میں کمال حاصل ہے۔

سرمایہ دار نے جواب دیا۔ "ہمارے بچوں کو تو معاف رکھیئے۔ ہم ان کو اپنا ہی ہنر یعنی بلیک مارکیٹنگ ہی سکھائیں گے، بچے افسانہ نگار اور شاعر بن کر ایسی کون سی کمائی کرلیں گے جبکہ آپ جیسا عالم اور کامل فن بھیک مانگتا پھرتا ہے۔

حاصل:۔ ان کو علمی وفنی اداروں سے زیادہ چور بازار کی ضرورت ہے۔

حکایت نمبر ۳

ایک پیر مرد اور اس کا بیٹا دونوں سفر میں تھے۔ اور ایک ٹٹو بھی ساتھ میں تھا ٹٹو پر اوڑھنا بچھونا لادے دونوں باپ بیٹے پیدل چلنے گئے۔ لوگوں نے دیکھا اور کہا دیکھو یہ دونوں کیسے احمق ہیں، ٹٹو کو رکھتے ہوئے خود تکلیف اُٹھاتے ہیں، یہ سُن کر پیر مرد ٹٹو پر سوار ہو لیا، تب لوگوں نے کہا "دیکھو اس بے رحم باپ کو، آپ تو مزے سے ٹٹو پر سوار ہے اور بیٹا پاؤں پاؤں پیچھے گھِسٹتا چلا آتا ہے۔ تب پیر مرد ٹٹو سے اُتر پڑا۔ اور بیٹے کو سوار کرادیا۔ پھر بھی لوگوں نے کہا "دیکھو بے ادب اولاد کو۔ بڈھا باپ تو پاؤں پاؤں اور خود بے حیا ہٹا کٹا جوان سوار" تب بُڈھا ٹٹو پر آگے سوار ہوا اور بیٹے کو پیچھے بٹھالیا۔ تب بھی لوگوں نے کہا "کہ معلوم ہوتا ہے ٹٹو مانگے کا ہے۔ اسباب کے علاوہ دو آدمی لدلئے ان کو کچھ ترس نہیں آتا۔

حاصِل

تمام دنیا کو خوش کرنا محال ہے

حکایت نمبر ایضاً

ایک وزیر اور ایک سرمایہ دار دونوں سفر کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک "عوام" بھی تھا جس کو وہ ہانکے لئے جا رہے تھے غیر ملکی سرمایہ دار حکومتوں نے اُنہیں دیکھا اور کہا۔

"دیکھو۔ یہ دونوں کیسے احمق ہیں، عوام کو رکھتے ہوئے خود تکلیف اُٹھا رہے ہیں"۔

یہ سُن کر وزیر عوام پر سوار ہو لیا۔ تب لوگوں نے کہا۔

"دیکھو بے رحم وزیر کو۔ آپ تو مزے سے عوام پر سوار ہے اور سرمایہ دار جس کی وجہ سے اس کی وزارت قائم ہے پاؤں پاؤں گھسٹ رہا ہے"۔

تب وزیر عوام پر سے اُترا اور سرمایہ دار کو سوار کرا دیا۔ پھر بھی غیر ملکی سرمایہ دار حکومتوں نے کہا دیکھو اس بے ادب سرمایہ دار کو جو وزیر اُسے سرمایہ، الاٹ منٹ، لائسنس، پرمٹ وغیرہ دلاتا ہے وہ تو پاؤں پاؤں ہے اور خود بے حیا ہٹا کٹا عوام پر اکیلا سوار ہے"۔

تب وزیر عوام پر آگے سوار ہوا اور سرمایہ دار کو پیچھے بٹھا لیا۔

تب عوام بے چارا بوجھ سے تلملا کر چیخا۔ یہ کیا انصاف ہے۔ تم دونوں مجھ پر لد گئے ہو کیا تمہیں مجھ پر کوئی ترس نہیں آتا۔

حاصل:۔ ہر جمہوری حکومت بشمول پاکستان تعمیری نکتہ چینی کی دعوت دیتی ہے اور تخریبی نکتہ چینی کو جیل میں بند کرتی ہے یا اس پر سوار ہو جاتی ہے۔

حکایت نمبر ۴

ایک بھیڑیئے کے گلے میں اتفاق سے ہڈی اٹک گئی۔ ہر چند کھانسا اور بہتیری اُبکائیاں لیں

لیں۔ مگر ہڈی نکلی پر نہ نکلی۔ مجبور ہو کر سارس کے پاس گیا۔ اور کہا یار ۔۔ ہم تم دونوں ایک جنگل میں رہتے ہیں اس وقت حق ہمسایہ ادا کرو۔ میرے حلق میں ہڈی اٹک گئی ہے اور جان پر بنی ہے۔ مہربانی کر کے اپنی لمبی گردن سے ذرا اس کو نکال دو۔ اور یہ کام میں تم سے مفت بھی نہیں چاہتا۔ جو تم کہو گے سو دوں گا۔ سارس راضی ہو گیا اور بھیڑیے کے حلق میں اپنی لمبی گردن ڈال کر ہڈی کو کھٹ سے باہر نکال دیا۔

چند روز بعد بھیڑیا گورخر شکار کر کے لایا۔ اور دریا کے کنارے بیٹھ کر کھانے لگا۔ سارس نے دیکھا اور بڑی خوشامد سے پاس جا کر کہا کہ "آج میں بھوکا ہوں۔ گوشت کا ایک ٹکڑا مجھے دو۔" بھیڑیے نے تامل کیا۔ سارس نے دبی زبان سے ہڈی کو نکالنا یاد دلایا تو بھیڑیے نے کہا۔

"اے احمق یہ انعام کیا کم تھا کہ تو میرے حلق سے گردن صحیح سلامت نکال کر لے گیا۔"

حاصل:۔ ظالم اور موذی آدمی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور اس سے بہتری کی اُمید رکھنا نادانی ہے، دُنیا کے لوگ احسان کو جلدی بھول جاتے ہیں۔

حکایت نمبر "ایضاً"

ایک مسلم لیگی اُمیدوار عام انتخابات میں کھڑا ہو گیا۔ ہر چند کوشش کی۔ بہتیرا روپیہ خرچ کیا۔ مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مجبوراً وہ عوام کے پاس گیا۔ اور گڑگڑاتے ہوئے بولا:۔

"یار۔ اب تک میں نے جو تم پر ظلم کیا ہے، تم سے جو بے رُخی برتی ہے، اس کو آخری بار معاف کر دو۔ آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔ میری جان پر بنی ہے، انتخابات کا ٹکٹ حلق میں

اٹک گیا ہے۔ مہربانی کر کے تم مجھے ان انتخابات میں کامیاب کرا دو۔ یہ کام میں تم سے مفت بھی نہیں چاہتا۔ وزیر بنتے ہی تم جو کچھ مانگو گے وہ دوں گا۔"

عوام راضی ہو گیا۔ اور اتنے ووٹ دیئے کہ مسلم لیگی امید وار کامیاب بھی ہوا اور وزیر بھی بنا اس کے بعد عوام وزیر کے پاس پہنچا اور بولا۔

"اب حسب وعدہ ہمیں مکان بنوا دیجئے۔ روزگار دلایئے۔ کچھ نقد رقم دیجئے وغیرہ۔

وزیر نے ٹال مٹول کیا۔ تو عوام نے دبی زبان سے اس کو انتخاب میں کامیاب کرانے کا واقعہ یاد دلایا تو وزیر کو بڑا غصہ آیا۔ اور اس نے پولیس بلوا کر عوام کو جیل بھیج دیا۔

حاصل:۔ مسلم لیگی وزیر از خود استعفےٰ نہیں دیتے بلکہ انہیں ڈسمس کرنا پڑتا ہے۔

حکایت نمبر ۵

ایک کوا اخروٹ کو چونچ سے توڑ رہا تھا۔ مگر اخروٹ پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ گلہری نے دیکھا اور کوّے سے کہا۔

"کیوں اتنی زحمت اٹھاتا ہے۔ میں تجھے آسان تدبیر بتاؤں۔ اخروٹ بڑی دُور ہوا میں لے جا کر کسی بڑی چٹان پر پھینک دے۔ گرنے کے صدمے سے وہ پاش پاش ہو جائے گا۔"

کوّے نے ایسا ہی کیا۔ لیکن نیچے اُتر کر دیکھتا ہے کہ واقعی میں اخروٹ تو پاش پاش ہو گیا مگر مغز گلہری لے کر چلی گئی ہے۔ صرف چھلکے چھوڑ گئی ہے۔

حاصل:۔ خود غرض آدمی جو صلاح دیتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور سوچ لیتا ہے۔

حکایت نمبر ایضاً

ایک ایشیائی مُلک میں سخت قحط پڑا۔ وہاں کے قحط زدہ باشندوں کو غذائی امداد

دینے کے لئے امریکہ کا ایک زرعی مشن اس ایشیائی ملک میں پہنچا۔ زرعی مشن کے اراکین نے ایک کھیت میں ایشیائی کسان کو دیکھا کہ وہ پرانی وضع کے ہل سے زمین کی کاشت کر رہا ہے۔ امریکی زرعی مشن کے اراکین نے ایشیائی کسان سے کہا۔

"کیوں اتنی تکلیف اُٹھاتا ہے۔ میں تجھے آسان ترکیب بتاؤں۔ یہ لے ٹریکٹر اور چلا اسے کھیت میں اتنے میں ہم یہاں ٹیوب ویل کھودتے ہیں"

ایشیائی کسان خوش ہوا فصل بھر ٹریکٹر چلاتا رہا۔ جب فصل کاٹنے کا وقت آیا تو اس نے دیکھا کہ اناج سارا غائب ہے۔ صرف ٹریکٹر باقی رہ گیا ہے۔

حاصل :۔ امریکہ ایشیائی قوموں کو جو مدد دیتا ہے اس میں اپنا کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور سوچ لیتا ہے۔

حکایت نمبر ۲

ایک شیر ایک بیل کے پیچھے دوڑا۔ بیل بدحواسی کی حالت میں ایک گڈریئے کے گھر گھسنے لگا۔ گڈریئے کی بکری نے بیل کو روکا۔

بیل نے کہا۔ "تو بڑی بے رحم ہے میں جان بچا کر تیرے پاس پناہ لینے آیا ہوں اور تو روکتی ہے۔ بکری نے کہا۔ رحم کروں تو اپنی جان پر آفت لاؤں، اور اگر اپنے تئیں بچاؤں تو بے رحم کہلاؤں۔

حاصل :۔ ہم کو لوگوں کی رعایت کرنی چاہیئے لیکن ایسی نہیں کہ اپنا نقصان کریں۔ اوّل خویش بعد درویش۔

حکایت نمبر ایضاً

تحریک ختم نبوت کے ہنگاموں کے سلسلے میں جب پاکستان میں پکڑ دھکڑ شروع ہوئی

تو اس وقت ایک پولیس کا سپاہی ایک داڑھی والے کے پیچھے دوڑا۔ داڑھی والا بدحواسی کے عالم میں ایک مونچھوں والے کے گھر میں گھسنے لگا۔ مونچھوں والے نے اُسے روکا تو اسے داڑھی والے نے کہا۔

"تو بڑا بے رحم ہے، کافر بھی معلوم ہوتا ہے۔ میں جان اور داڑھی بچانے تیرے پاس پناہ لینے آیا ہوں اور تو روکتا ہے۔ لعنت ہے تجھ پر۔"

مونچھوں والے نے کہا۔

"میاں! یہ تو ہو ہی رہا ہے کرتا ہے داڑھی والا اور پکڑا جاتا ہے مونچھوں والا۔ اگر رحم کروں تو اپنی جان پر آفت لاؤں اور اپنے تئیں بچاؤں تو کافر کہلاؤں۔ یہ بھی خوب رہی ماشاء اللہ کیا تم نے نہیں سنا کہ سکھر میں مارشل لا لگا ہوا ہے۔"

حاصل:۔ ہم کو پولیس کے نرغے سے بچنے والے سیاسی معززین کی پناہ دینی چاہیئے لیکن اس وقت نہیں جبکہ ملک میں مارشل لا لگا ہوا ہو۔

حکایت نمبر ۷

ایک بلّی نے شیرنی پر طعنہ کسا کہ تو میری برابری کیا کرے گی میں ایک جھول میں دس بچّے دیتی ہوں اور تو صرف ایک۔ شیرنی نے جواب دیا۔ "ہاں! مگر میرا بچّہ بڑا ہو کر شیر ہوتا ہے۔"

حاصل:۔ ایک لائق بیٹا اچھا اور دس نالائق کچھ نہیں۔

حکایت نمبر ایضاً

ایک غریب عورت نے شہر کے میئر کی بیوی پر طعنہ کسا۔

"اری تو میری برابری کیا کرے گی۔ بڑی آئی میئر کی بیوی۔ میں دس سال میں دس بچے قوم کو دیتی ہوں اور تو دس سال میں صرف ایک تو کیا قوم کی خدمت کرتی ہے؟"

میئر کی بیوی نے کہا: "تیرے دس روتی صورت بچوں سے میرا ایک بچہ اچھا۔ وہ بڑا ہو کر میئر بنتا ہے" غریب کی بیوی نے کہا: "میئر بننے سے کیا ہوا۔ قوم کی خدمت کہاں ہوئی"

میئر کی بیوی نے کہا: "میں کیوں قوم کی خدمت کروں جبکہ قوم میری خدمت کرتی ہے؟"

غریب کی بیوی لاجواب ہو گئی اور بولی "بہن تو سچ کہتی ہے"

حاصل:۔ (لاحاصل) غریب کی بیوی یہ کہہ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

سینما گھر ایک اِسکول ہے

پاکستان اور ہندوستان جہاں غریبی اور مفلسی دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ ہے وہاں عام آدمیوں کے لئے سب سے زیادہ سستی قسم کی تفریح سینما بینی ہے۔ دن بھر کے کام کاج اور محنت مشقت کے بعد لوگ باگ جب تھکے ہارے گھر لوٹتے ہیں تو گھر میں ایک بیمار اور بدصورت بیوی اور روتی صورت بچے ان کی دن بھر کی کوفت اور تھکن میں اور زیادہ اضافہ کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے عام لوگ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی بیمار اور مریل بیوی سے دور اور مادھو بالا سے قریب تر ہیں۔ ٹھنڈے چولھے والے گھر کے بجائے آرام دہ فرنیچر والے سینما گھر میں اپنا وقت ضائع کریں۔ چنانچہ آپ دوپہر سے لے کر آدھی رات تک پاکستان اور ہندوستان کے کسی سینما گھر پر طائرانہ نظر ڈالیں تو آپ کو یہ محسوس ہو گا۔ جیسے سینما گھر کسی مردہ چوہے کی لاش ہے جس سے بے شمار چیونٹیاں چمٹی ہوئی ہیں۔

میں نے نہ صرف فلم بنانے والے آدمیوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بلکہ فلم

دیکھنے والوں کا بھی بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اکثر اوقات فلم دیکھنے والے فلم بنانے والوں سے زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز واقع ہوتے ہیں۔

میں نے ایک بار بڑی سنجیدگی سے غور کیا کہ ہمارے عام غریب آدمی سینما کے اتنے شائقین کیوں ہیں؟ وہ اپنی چھوٹی تنخواہوں اور قلیل آمدنیوں میں اپنی روزمرہ زندگی کے اخراجات پورے نہیں کر سکتے تو سینما کیوں دیکھتے ہیں؟ اور سینما دیکھنا اُن کے لئے کیوں ضروری ہے۔ کیا یہ افسوسناک فضول خرچی نہیں ہے؟

ان سوالات پر بڑی دیر تک غور کرنے کے بعد میں ان جوابات تک پہنچا۔ دن بھر سخت محنت مشقت کرنے کے بعد آدمی آرام و تفریح چاہتا ہے۔ یا پھر کھیل کود۔ ہمارے ملکوں میں عام آدمیوں کے لئے نہ مفت کلب ہیں اور نہ مفت کھیلوں کے اسٹیڈیم نہ دے کے پبلک باغیچے ہیں۔ جہاں جاتے ہوئے عام آدمی اس لئے ڈرتے ہیں کہ پولیس کے سپاہی انہیں جیب کترے یا عورتوں کے پریشان کرنے والے بدمعاش قرار دے کر پکڑ لیتے ہیں۔ رہی سڑکیں تو اُن پر گھومنا پھرنا اس لئے بھی مصیبت بن جاتا ہے کہ پولیس انہیں دفعہ ۱۰۹ آوارہ گردی میں چالان کر دیتی ہے۔ کیونکہ اُن کے کپڑے میلے ہیں اور صورت سے وہ صاف غریب آدمی معلوم ہوتے ہیں اور پولیس کی نظر میں ہر غریب آدمی بلاشبہ آوارہ آدمی ہوتا ہے۔ اب رہ جاتا ہے گھر۔ گھر بھلا کیا تفریح گاہ بن سکتا ہے؟ جب کہ گھر میں اور کال کوٹھری میں یوں ہی ذرا جگہ کا فرق ہوتا ہے۔ گھر میں بیوی کا بستر واحد تفریح کی جگہ ہے لیکن اس کے دُور رس نتائج بڑے پریشان کن ہوتے ہیں یعنی ہر سال ایک بچہ یا جڑواں بچے!۔۔۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ عام آدمیوں کی بیویاں بالعموم خوب صورت نہیں ہوتیں۔ وہ بالعموم سیاہ یا سانولی چیچک رُو اور بدوضع

پوشاک اور غلیظ ہوتی ہیں۔ اور ان عورتوں کی خاطر اُنہیں ہر ماہ کم از کم پچاس روپے سے لے کر زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو روپیہ کمانے اور اُن پر خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس ہر روز صرف نو آنے خرچ کر کے وہ ڈھائی گھنٹے تک سینما سے حسین ایکٹرس کو خرید لیتے ہیں۔ کامنی کوشل صرف نو آنے میں اپنا سارا حسن و جمال ان کی خدمت میں پیش کر دیتی ہے۔ نرگس اپنی ساری داستانِ محبت ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ ثمیّ اپنی دل نواز موسیقی سے اُنہیں محفوظ کرتی ہے۔ گیتا بالی اور ککو ان کو خوش کرنے کے لئے ٹھمک ٹھمک کر اور تھرک تھرک کر ناچتی رہتی ہیں۔ گوپ اور یعقوب ہنسا ہنسا کر اُنہیں ادھموا کر دیتے ہیں۔

یہ سب صرف ڈھائی گھنٹوں کے لئے مگر صرف نو آنے میں

لیکن دن بھر کے سخت کام کاج کے بعد ڈھائی گھنٹے کی ایسی حسن و عشق، ناچ رنگ اور ہنسی دل لگی سے لبریز اور بھرپور تفریح ان کی تھکی ہوئی طبیعتوں کو از سرِ نو تازہ کر دیتی ہے اور وہ اپنی بیوی بچوں کے لئے تو نہیں کم از کم گیتا بالی کی خاطر زندہ رہنے کے لئے خودکشی کے اس خیال سے باز آجاتے ہیں۔ جو بنئے کے قرض کے مسلسل تقاضوں سے عاجز آکر صبح ان کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ سینما گھر سے باہر نکلتے ہوئے وہ دل ہی دل میں بنئے کو دھتکار بتاتے ہیں۔

"بنئے کی ایسی تیسی۔ کیوں حرام موت مریں؟ قرضہ کبھی نہ کبھی ادا کر ہی دیں گے۔ اگر اس ذلیل قرضے کی وجہ سے بے موت مر گئے تو کامنی کوشل اور نرگس کا حسن کہاں نظر آئے گا۔ ثمیّ اور گیتا بالی کے ہیجان انگیز جسم کہاں دیکھ سکیں گے۔ لتا منگیشکر کس کے لئے نغموں کا جادو جگائے گی اور ککو کس کے لئے ناچا کرے گی؟"

ہمارے عوام کی روزمرّہ کی مصیبتوں اور دکھوں سے بھرپور زندگی کو سہارا دینے میں

ہمارے فلم بڑے حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ میرا ایک دوست رشید خاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں سے تنگ آکر ایک دن اپنی زندگی ختم کرنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ لیکن جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں اس کا غم غلط کرنے کے لئے ایک فلم دکھانے لے گیا۔ اور اس فلم نے اس کی جان بچالی۔ وہ فلم اس کی زندگی سے بڑی ملتی جلتی تھی۔ بالخصوص اس فلم میں ایک گیت تھا جس کے بول یہ تھے ؎

انسان کیا جو ٹھوکریں نصیب کی نہ سہہ سکے

یہ گیت سنتے ہی میرا دوست آب دیدہ ہو کر بولا: "یار میں نے مرنے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ اب زندہ رہوں گا۔ اور زندگی سے مردانہ وار لڑتا رہوں گا" اس کے بعد سے وہ روزانہ نصیب کی ٹھوکریں کھاتا چلا رہا ہے۔ لیکن چہرے سے بڑا مطمئن نظر آتا ہے اور ہردم گنگناتا رہتا ہے ؎

انسان کیا جو ٹھوکریں نصیب کی نہ سہہ سکے

اس کے علاوہ جب وہ اپنے اردگرد اپنے جیسے مصیبت زدہ لوگوں کو روتا سسکتا دیکھتا ہے تو ان کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر گاتے ہوئے مشورہ دیتا ہے۔

گائے چلا جا، گائے چلا جا
ایک دن تیرا بھی زمانہ آئے گا

میں اپنے ملک کے سینما گھروں کو ایک ایسا اسکول سمجھتا ہوں جہاں انسان کو بڑی سے بڑی مصیبتیں برداشت کرنے کے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کسی عورت کا انتخاب کر کے اس سے محبت کرتے رہنے، مالدار رقیب کو نیچا دکھانے اور آخر میں اپنی محبوبہ سے شادی کرنے کے مفید اور زندگی آموز سبق پڑھائے جاتے ہیں۔

کسی کا یہ اعتراض بالکل ٹھیک ہے کہ ہمارے سینما گھر، ہمارے عوام کو جوق در جوق ایک طرح کے "گناہ بے لذت" کی طرف راغب کر رہے ہیں لیکن میرے خیال کے مطابق گناہ بے لذت، گناہ بالذت" کے مقابلے میں زیادہ بہتر گناہ ہے۔ اگر ہمارے سینما گھر نہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ ہمارے غریب عوام میں شراب خوری اور زناکاری کی وبائیں کثرت کے ساتھ پھیل جائیں چنانچہ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ پچھلے دنوں کراچی کے مالکان سینما نے ہڑتال کردی تھی، اور سارے سینما گھر بند ہو گئے تھے تو اس وقت کراچی کے سارے شراب خانوں، تاڑی گھروں اور رنڈیوں کے کوٹھوں پر تل دھرنے کیلئے جگہ نہیں ملتی تھی۔ ان دنوں شراب فروش ہوٹل والے، تاڑی فروش اور رنڈیاں بڑے خلوص سے دعائیں مانگ رہی تھیں کہ خدا کرے کہ سینما ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں اور ہمارے میکدے اور کوٹھے ہمیشہ اسی طرح آباد رہیں ان دنوں کا ایک غیر متعلق واقعہ ہیں آپ کو بتا دوں کہ دنوں شراب خانوں میں یہ مقولے بڑے بڑے بورڈوں پر لکھ کر لگوائے گئے تھے کہ۔

"صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے"

اور رنڈیاں اس طرح کی غزلیں اور گیت گا رہی تھیں۔

(۱) وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

(۲) گھر آیا مورا پردیسی آس مٹی مری آنکھوں کی

اس کے بعد اچانک ہڑتال ختم ہو گئی، سینما کھل گئے تو شراب خانے بھی خالی ہو گئے اور رنڈیوں کے کوٹھے بھی ویران ہو گئے۔ رنڈیاں بڑا چیخ چیخ کر گاتی ہیں۔

رات ہے تاروں بھری چھٹکی ہوئی چاندنی

ایسے میں آیا لما پیار کی باتیں کریں

ہو پیار کی باتیں کریں

لیکن نمی، بینا رائے، صبیحہ، نور جہاں، شمی، گلشن آرا حتیٰ کہ بوڑھی کھوسٹ لیلا چٹنس تک نے لوگوں کا دامن نہ چھوڑا اور انہیں بری راہ پر نہ جانے دیا۔ لوگ باگ گناہ بالذت سے پھر گناہ بے لذت کی طرف لوٹ آئے اس طرح ان کا اخلاق و کردار برائی کی طرف جاتے جاتے پھر اچھائی کی طرف لوٹ آیا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ فلم بینی عام غریب آدمی کیلئے ایک فضول خرچی ہے لیکن یہ اس فضول خرچی سے لاکھ درجہ بہتر ہے جو شراب بنکر بہہ جاتی ہے یا پھر بازارِ حسن سے خریدی ہوئی بیماریوں کا انجکشن بن جاتی ہے عام طور پر لوگ فلم بینی کے نتائج کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فلم بینی نے ہمارے بیشتر عوام کو صرف ایک ہلکی سی فضول خرچی میں مبتلا کر کے دوسری بڑی مہنگی اور تباہ کن برائیوں سے بچا لیا ہے۔ کراچی کے مالکان سینما نے کچھ دنوں کے لئے سینما گھروں پر تالے لگا کر ہماری آپ کی آنکھیں کھول دیں اور بتا دیا کہ سینما گھروں کا وجود عوام کے اخلاق کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے کتنا ضروری ہے۔ یوں تو سینما گھر بھی عوام کے لئے ایک "جھک مارنے" کی جگہ ہے لیکن سینما بند ہو جانے کے بعد عوام جھک مارنے کی کیسی کیسی خطرناک جگہوں پر جاتے رہے ہیں! لیکن شکر ہے کہ سینما گھروں کی ہڑتال ختم ہوتے ہی عوام نے "شام ڈھلے کھڑکی تلے سیٹی بجانا چھوڑ دیا۔" اور اس راہ راست پر آگئے ہیں ریگل، ایروز، ناز، تاج محل، پلازا، ریکس، پیراڈائز، نشاط حتیٰ کہ بازارِ حسن میں سے گذرتا ہوا سپر، راکسی اور نور محل سینما تک چلا جاتا ہے۔ لیکن کوئی محبوب نوروزی راستہ نہیں بھٹکتا اور سارے محبوب نوروزی "شیاما" کو دیکھ دیکھ کر صرف آنکھیں سینکنے پر اکتفا کئے لیتے ہیں۔

ہمارے سینما گھر دوسرا جو مفید سبق انسانوں کو سکھاتے ہیں وہ ہے "محبت کا سبق"۔

ہمارے سینما گھر انسانوں کو کبھی نفرت کا سبق نہیں سکھلاتے۔ اس دور میں جب کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی محبت کی شدید ضرورت ہے، ہمارے سینما گھر بہت بڑا انسانی فریضہ انجام دیتے ہیں اب یہ اور بات ہے کہ وہاں مرد کو صرف عورت سے اور عورت کو صرف مرد سے محبت کرنے کا سبق سکھایا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو خالص انسانی محبت ہوئی۔ اس کے علاوہ اگر مرد عورت سے نہیں تو کیا گائے بکری سے، اور عورت مرد سے نہیں تو کیا ہاتھی گھوڑے سے محبت کرے۔

ہمارے سینما گھروں میں محبت کا کوئی لمبا پیچیدہ اور صبر آزما قسم کا سبق نہیں سکھایا جاتا بلکہ بہت مختصر اور بہت آسان یعنی "جٹ محبت اور پٹ بیاہ" چنانچہ ان سینما گھروں سے نکلنے کے بعد ایک محلہ کے آمنے سامنے گھروں میں رہنے والی لڑکی اور لڑکا جب باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکیاں کھولتی اور کھولتا ہے تو دونوں ایک دوسرے کو دلیپ کمار اور مدھو بالا کی طرح بس دیکھتے ہی عاشق ہو جاتے ہیں۔ اس کے ایک ڈیڑھ مہینے بعد دونوں میں شادی ہو جاتی ہے اور اگر شادی نہیں ہو سکتی تو وہ دونوں رات کے اندھیرے میں گیتا بالی اور دیو آنند کی طرح بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور لاہور میں پکڑے جاتے ہیں اور پھر فلم "دل کی بات" کی طرح دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ ہمارے سینما گھروں میں جٹ محبت اور پٹ بیاہ کا درس اس لئے دیا جاتا ہے کہ کہیں لوگ باگ غصہ میں آ کر سینما گھر کا فرنیچر نہ توڑ دیں کہ کیوں تم نے سنتوش کمار کی شادی صبیحہ سے نہیں کرائی۔ ہمارے عوام بالعموم منصف مزاج ہوتے ہیں اور ہر معاملہ میں حق بحق دار رسید کے قائل ہوتے ہیں اس کے علاوہ شرع کا ایک پہلو یہ نکلتا ہے کہ کنوارے مرد اور کنواری عورت کو جنت میں جگہ نہیں مل سکتی۔ اس لئے ہمارے سینما گھر جو عام غریب آدمیوں کو اُن کی روزمرہ کی زندگیوں کے جہنموں سے نکال ڈھائی گھنٹے

کے لیے فلمی دنیا کی بہشت میں لے جاتے ہیں۔ اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے تماشائی فلمی طرز کی محبت اور شادیاں کر کے دنیا سے سیدھے جنت میں جائیں۔ اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ اگر فلم کے آخر میں شادی نہ ہو تو پھر "مزہ" نہیں آتا اور لوگ "مزے" کے لیے فلم دیکھتے ہیں۔ اب بھلا یہ بات ہی کیا ہوئی کہ دلیپ کمار چھ بجے شام سے سوا آٹھ بجے رات تک شیاما سے محبت کرتا رہا۔ اور آٹھ بجکر بیس منٹ پر ان کو چھوڑ چھاڑ کر ہمالہ پہاڑ پر جا کر سادھو بن جائے یہ بھلا کیا مزا آیا۔ مزا تو جب ہی ہے کہ نورجہاں اور سنتوش کمار رٹز سینما میں شادی کریں۔ اور ہم آپ اپنے گھر آ کر دال روٹی کا "ولیمہ" کھائیں۔

ہمارے سینما گھر ہمارے عوام کو سب سے زیادہ اہم جو سبق پڑھاتے ہیں۔ وہ ہے طبقاتی نفرت کا سبق یعنی غریب کا غریب کی مدد کرنا اور آخر میں اور دولت مند آدمی کو نیچا دکھانے کا سبق آپ نے ہر فلم میں دیکھا ہو گا کہ ایک غریب مگر تندرست اور خوبصورت نوجوان ہوتا ہے۔ اس پر ایک امیرانہ دولت مند آدمی کی نوجوان لڑکی عاشق ہو جاتی ہے اس امیر لڑکی کا باپ غریبوں پر بڑا ظلم ڈھاتا ہے تو غریب نوجوان اس لڑکی سے چھیڑ خانیاں کر کر کے خوب بدلہ چکاتا ہے اور آخر میں جب امیر لڑکی اپنے مال دار باپ کی دولت کو ٹھوکر مار کر غریب نوجوان کی تنگ و تاریک "چال" میں بیٹھی چولھا پھونکتے پھونکتے رونے لگتی ہے تو سینما گھر میں بیٹھے ہوئے سارے تماشائی خوش ہو کر زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں، سیٹیاں بجاتے ہیں اور چیخنے لگتے ہیں

"واہ بیٹے پریم ناتھ! خوب بدلہ لیا ہے اور مزا چکھا سالی کو"

اور جب امیر لڑکی کا باپ اپنی مغرور لڑکی کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا غریب نوجوان کی "چال" پر پہنچتا ہے تو اُس کی چالی کے غریب لونڈے اس کی کار پر پتھراؤ شروع کرتے

ہیں اور سینما بین گالیوں کی بوچھاڑ، اور جب امیر باپ اپنی ناز و نعم میں پلی ہوئی لڑکی کو غریب نوجوان کا گندہ انڈرویر اور لنگی دھوتے دیکھتا ہے، تو اس پر برس پڑتا ہے لیکن امیر لڑکی صاف صاف کہہ دیتی ہے۔

"پتاجی! مجھے پریم ہوگیا ہے (یعنی پریم ناتھ) ہوگیا ہے، پریم عالیشان کوٹھیوں میں نہیں رہتا۔ پریم غریبوں کی کٹیاؤں میں رہتا ہے"!

اس ڈائیلاگ پر سینما دیکھنے والے "ابے گامے" چیخ پڑتے ہیں۔

"واہ پتّی، جیوندی رہ"!

اس کے بعد جب اسکا امیر باپ سر جھکائے واپس جانے لگتا ہے تو سینما بین نفرت سے پکارتے ہیں

"وھت۔ ہات تیری پاپڑ والے"!

"نس جا ایتھوں کمینیا"!

"ڈھررر"!

دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس کی مڈبھیڑ ہیرو غریب نوجوان سے ہوتی ہے تو امیر آدمی اسے دس ہزار روپے کے نوٹ دیتا ہے۔ دس ہزار روپے لے اور لڑکی واپس دیدے لیکن غیور غریب نوجوان (جو صرف دس ہزار کے عوض فلم کے ہیرو کی طرح کام کر رہا ہے) وہ دس ہزار روپے امیر آدمی کے منہ پر دے مارتا ہے۔ اس پر غریب تماش بینوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ بس ان کا کرسیاں توڑنا باقی رہ جاتا ہے۔

اب اس سلسلے میں ایک راز کی بات یہ ہے کہ امیروں کے خلاف غریبوں کے دل میں فلموں کے ذریعہ نفرت پیدا کرنا بھی خود امیروں اور دولت مندوں کی ایک نفع بخش تجارت ہے فلمیں صرف دولت مند لوگ بناتے ہیں اور ایک ایک فلم پر لکھوکھا روپے خرچ ہوتے ہیں۔ اس

فلم میں امیر و غریب کی ٹکر اور امیر کو گالیاں اور غریب کو فتح اسی لئے دلاتے ہیں کہ ایسا کرنے سے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں فلمیں دیکھتے ہیں اور خوب نفع ہوتا ہے۔ اب اس نفع کی خاطر اگر امیروں کو ہر روز ڈھائی گھنٹہ کے حساب ساڑھے سات گھنٹے تک گالیاں پڑتی رہیں تو کیا ہرج ہے! دولت مند آدمی یوں بھی دولت کے معاملے میں بڑے بے غیرت ہوتے ہیں۔

اب یہ اندرونی راز چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ تو ایک حقیقت ہے کہ ہمارے سینما گھر آہستہ آہستہ ہمارے عوام میں طبقاتی شعور پیدا کرتے جا رہے ہیں اور غریب انسانوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایک دن تیرا بھی زمانہ آئے گا، اس لئے گائے چلا جا، گائے چلا جا ٹیکسی ڈرائیور ہے تو کیا ہوا سیٹھ جی کی لڑکی کو اغوا کر کے لے آ اور اپنا میلا کچیلا لنگوٹ اس سے دھلوا، اس سے اپنا برسوں کا ٹھنڈا چولھا گرمایا کر۔ اور پھر کھٹیا پر لیٹ کر بڑے آرام سے اپنی دولت مند محبوبہ کو مخاطب کر کے گا ؎

مان میرا احسان ارے نادان کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار

اور سینما گھر کا شکریہ ادا کرو جس نے تجھے زندگی کا کتنا اہم سبق سکھایا ہے۔

ابھی ایورسٹ فتح نہیں ہوا

کوہستان ہمالہ کی وہ بلند قامت اور مغرور بیٹی ایورسٹ جو ابتدائے آفرینش سے ایک "پُراسرار برفانی آدمی" کی قید میں تھی، اور جس کو اس قید سے آزاد کرانے اور اُسے حاصل کرنے کے لئے انسانی قوت دس مرتبہ موت، شکست اور مایوسی کی گہرائیوں میں گر چکی تھی۔

وہی بلند قامت اور مغرور حسینہ بالآخر سال ۱۹۵۳ء کے مہینے مئی کے ۲۹ دن انسان کی عظیم ترین قوت کی آغوش میں بے بس ہو کر گر پڑی۔ اب وہ پُراسرار برفانی آدمی اپنے پہلے دشمن اور نئے رقیب انسان سے بدلہ لینے کے لئے دیوانہ وار ہمالہ کی چوٹیوں میں بھٹک رہا ہے اور انسان ایورسٹ کو اپنی آغوش میں بھینچ کر فتح کی شرابیں پی رہا ہے۔ اب پُراسرار برفانی آدمی اور ہمالہ کی مغرور بیٹی کے رومان کی صدیوں پرانی کہانی ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے اور قدرت کی بے بسی اور انسان کی عظمت کے افسانے کا آغاز ہو چکا ہے۔

لیکن انسانی قوت کی عظیم ترین فتح کی تصویر کا یہ رُخ جتنا درخشاں اور شاندار ہے

اس کا دوسرا رُخ اتنا ہی تاریک اور افسوسناک ہے۔ یعنی انسان کی اتنی بڑی فتح کو ایک شاہی کنیز بنا کر ایک مُلک کی ملکہ کے جشنِ تاجپوشی کے دن بطور تحفہ اس کے حرم میں داخل کردیا گیا ــــــ ایورسٹ کی تسخیر جہاں انسانی قوّت کا ایک ابدی کارنامہ ہے وہاں اس کے ساتھ بعد کا سلوک انسانی ذہن کی پستی کو عریاں کردیتا ہے یعنی ایورسٹ کی تسخیر بیک وقت انسان کی بلندی اور پستی کی ایک تاریخ مرتب کرتی ہے کہ انسان کا جسم جہاں دنیا کی سب سے اونچی "بلندی" تک پہنچ سکتا ہے وہاں انسان کا ذہن اتنی ہی "پستی" میں بھی گر سکتا ہے۔

ہمالہ کی سب سے زیادہ بلند قامت اور مغرور حسینہ کو ۲۹ مئی کو گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن اتنے بڑے انسانی کارنامے کو پورے تین دن تک ساری دُنیا کے انسانوں سے چھپا کر صرف ایک انسان کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کھٹمنڈو کے برطانی سفارت خانے میں پُراسرار طریقے پر چھپا دیا گیا۔ اور ٹھیک اس دن جس دن ایک انسان یا ایک ملکہ کی تاجپوشی ہو رہی تھی۔ انسان کے اس زبردست کارنامے کو ریڈیوں کی لہروں، ٹیلی ویژن کے پردوں اور اخباروں کے صفحات کے حوالے کیا گیا۔ محض ایک انسان اور وہ بھی ایک حکمران کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر حالانکہ یہ کارنامہ دنیا کے سارے انسانوں کے لئے خوشی غرور اور فخر کا باعث ہے۔ اس کارنامے کے صحیح حقدار اور اصلی مستحق ساری دنیا کے عوام ہیں۔ کیونکہ صحیح معنی میں دنیا کے ہر بڑے سے بڑا معرکہ کسی عام آدمی یا عوام نے سر کیا ہے کسی شہد بیچنے والے ہلاری نے سر کیا ہے یا کسی غریب پہاڑی قلی شیر یا تین سنگھ نے۔

ایورسٹ کے خوفناک عاشق "برفانی آدمی" کو سب سے پہلے شیر یا تین سنگھ نے مار گرایا ایورسٹ کی کلائی سب سے پہلے نیپال کے اُس پہاڑی قلی نے پکڑی لیکن آج ایورسٹ قصر بکنگھم میں پہنچا

دی گئی اور سادہ لوح تین سنگھ ساری دُنیا کے اخباروں میں اپنی تصویریں دیکھ دیکھ کر صرف حیران ہو رہا ہے اور صرف خوش ہو رہا ہے۔

غریب اور سادہ لوح ہلاری اور تین سنگھ جنہوں نے دنیا کی سب سے اونچی جگہ پر سات سمندر پار کی ملکہ کی حکومت کا پرچم یونین جیک لہرایا اور جو اس وقت دنیا کی سب سے اونچی چھت پر کھڑے ہو کر فتح کی خوشی سے مسرور ہو کر برانڈی کے جام پر جام چڑھا رہے ہیں۔ ٹین کے ڈبوں میں محفوظ سینڈوچز کے قتلے کھا رہے ہیں اور پہاڑی تمباکو کی سگریٹیں پی رہے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ جو جھنڈے اُنہوں نے دُنیا کی سب سے بلندی پر گاڑے ہیں، وہ اُن کے اپنے جھنڈے نہیں، انسانی قوت اور عظمت کے نہیں بلکہ ان طاقتوں کے جھنڈے ہیں جنہوں نے ہلاری اور تین سنگھ کو، ان کے وطن کو اور ان جیسے سینکڑوں انسانوں کو غلام بنایا ہے۔ اور تین سنگھ یہ بھی نہیں جانتے کہ انہوں نے ابتدائے آفرنیش سے اور صدیوں سے آزاد ایورسٹ کو بھی اُن طاقتوں کا غلام بنا دیا ہے جن کی غلامی ہلاری اور تین سنگھ کا مقدر بنی ہوئی ہے۔

ہلاری اور تین سنگھ نے انسانی عظمت کو جس ایورسٹ پر چڑھایا ہے، اس کی تعریفیں اور مبارکبادیاں دنیا کے گوشے گوشے سے پرواز کر کے قصر بکنگھم میں جمع ہو رہی ہیں جن کے درمیان ایک نوعمر عورت کھڑی غرور سے مسکرا رہی ہے اور تین سنگھ اور ہلاری ساری دنیا کی نظروں سے روپوش ہیں۔ صرف ان کے "نام" منظرِ عام پر آ گئے ہیں اور ان کے "کام" اُن سے چھین گئے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ماؤنٹ ایورسٹ اب ماؤنٹ تین سنگھ یا ماؤنٹ ہلاری کے بجائے "ماؤنٹ الزبتھ" بننے والی ہے اور ایک مخصوص سامراجی ذہن ساری دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے کہ

"ملکہ الزبتھ سے پہلے سلطنت برطانیہ کا سورج کبھی نہیں غروب ہوتا تھا اور اب

ملکہ الزبتھ کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے دُنیا کی سب سے اونچی چھت پر یونین جیک لہرا رہا ہے اب ملکہ الزبتھ صرف بحر و بر کی ملکہ نہیں بلکہ دشت و جبل کی ملکہ بھی ہے۔ ملکہ الزبتھ اب انسانوں کے علاوہ "برفانی مخلوق" کی بھی آقا ہے"

ساری دنیا جانتی ہے کہ دنیا کی سب سے اونچی چھت پر انسانی قدم جو نشان ثبت ہوا ہے وہ ہندوستانی نژاد نیپالی قلی شیرپا تین سنگھ کا قدم ہے جو دارجلنگ کے شہر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہے جس کی ایک خوبرو بیوی اور دو ننھی لڑکیاں ہیں۔ پانچ فٹ تین انچ لمبے اور مضبوط جسم کا یہ ۳۹ سالہ قلی بچپن ہی سے پہاڑوں کا دوست ہے اور بچپن ہی سے اُسے اس پُر اسرار برفانی آدمی کی تلاش تھی جو دُنیا کی سب سے بڑی بلندی پر ہمالہ کی حسین سرکش اور مغرور بیٹی کے حسن و جمال کے مزے لوٹتا تھا۔ پہاڑوں کا یہ بچپن کا گہرا دوست اس سے پہلے کوئی دس بار ایورسٹ کے مغرور حسن اور سرکش جوانی کو اس کے قدموں میں لا پھینکا۔ اب ایورسٹ کا ہیرو تین سنگھ ہے۔ اب ایورسٹ کو ماؤنٹ الزبتھ کہنا ایورسٹ کی فتح کو باطل کر کے جھوٹے نام و نمود اور جھوٹے اقتدار کے ایک اور ایورسٹ کو بلند کرنے کے برابر ہے۔

اس لئے ایورسٹ کی فتح کو صرف کسی جشن تاجپوشی کا ایک تحفہ بنا دینا نہ صرف ایورسٹ کی بلندی کو کبڑا کر دیتا ہے بلکہ انسانی قوت اور عظمت کو ذلت کی پستیوں میں پھینک دیتا ہے ایورسٹ کی بلندیوں کو صرف ایک قوم اور چند ملکوں کے تین جھنڈوں کو لہراتا دیکھ کر انسانیت کا سر چند انسانوں کی خود غرضی سے متاثر ہو کر شرم سے جھک جاتا ہے۔

کیا ایورسٹ پر کوئی ایسا جھنڈا نہیں لہرایا جا سکتا جو کسی ملک اور کسی قوم کا جھنڈا نہ ہو؟ کیا دنیا کی پہلی چھت پر ایسا کوئی پرچم نہیں گاڑا جا سکتا تھا جو صرف انسانوں کی عظیم ترین قوت کا مظہر ہے؟ ایسا پرچم

جو اس دنیا کے کروڑوں تین سنگھوں اور کروڑوں ہلاریوں کی عظیم اجتماعی قوت کی طرح بلند ہوتا، لہراتا اور ہمیشہ ہمیشہ لہراتا رہتا۔

ایورسٹ کی فتح دنیا کے سارے انسانوں کی فتح ہے۔ یہ کسی طرح بھی ایک ملکہ کی فتح نہیں قرار دی جا سکتی۔

کوہ پیمائی یا پہاڑوں پر چڑھنا من چلے اور کھلنڈرے انسانوں کا ایک پرانا ہابی، ایک تفریحی مشغلہ اور ایک دلچسپ اسپورٹ ہے۔ یہ انسانی فطرت کا ایک مخصوص کردار ہے انسان ہمیشہ بلندی سے عشق کرتا ہے چاہے وہ کسی بلند قامت پہاڑ کی ترائی میں ہو یا اپنے کمرے کی کرسی پر بیٹھا ہو۔ وہ دنیا کی بلندیوں کے علاوہ زندگی کی بلندیوں تک بھی پہنچنے کے لئے ہر دم جد و جہد کرتا ہے جس طرح کوہستان ہمالہ کا اپنا ایک ایورسٹ ہے، اسی طرح ہر انسان کی زندگی کا ایک ایورسٹ ہوتا ہے۔ اور ہر انسان غیر محسوس طریقے پر اپنے اپنے ایورسٹ کی جانب چڑھتا رہتا ہے۔ اب یہ محض اتفاق ہی ہے کہ نیوزی لینڈ کے شہد بیچنے والے تاجر کے لڑکے اے پی ہلاری اور ہندوستانی نژاد نیپالی پہاڑی قلی شیرپا تین سنگھ کی زندگی کا ایورسٹ بھی وہی تھا جو کوہستان ہمالہ کا ایورسٹ ہے۔ اور آج ان دونوں کی زندگیوں کی مسرتیں بھی اس ایورسٹ تک پہنچ چکی ہیں۔

آج ایورسٹ کی تسخیر کا سارا سہرا برطانوی کوہ پیماؤں کے سر باندھا جا رہا ہے اور ہندوستانی نژاد شیرپا تین سنگھ کے کوٹ کے کالر میں صرف اس سہرے کا ایک پھول لگا یا گیا ہے۔ حالانکہ شیرپا تین سنگھ واحد اس سہرے کا مستحق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پچھلے ۳۲ سال سے ایورسٹ پر جو گیارہ حملے کئے گئے ان میں آٹھ حملے برطانوی کوہ پیماؤں کی طرف سے کئے گئے۔ لیکن تین سنگھ سارے گیارہ کے گیارہ حملوں میں شریک رہا اور ہر دفعہ اس کے گرد نئے نئے کوہ پیما تھے۔ ہمالہ کی چٹانوں اور برف کے گلیشروں

کے لئے صرف تین سنگھ ہی پرانا تھا۔ وہ پچھلے دس حملوں میں ہمالہ کے جسم اور مزاج سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اور برطانوی کوہ پیما ہمالہ کی بلند چوٹیوں پر چڑھنے سے پہلے تین سنگھ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے اور اسی کا ہاتھ تھام کر وہ چڑھائی کی مہم شروع کرتے تھے وہ اسی سے گھل مل کر باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ صرف تین سنگھ ہی وہ شخص تھا جو ہمالہ کی مغرور بیٹی اور پراسرار برفانی آدمی کے عشق کی پراسرار کہانی سے واقف تھا لیکن تین سنگھ ایک غریب قلی تھا اس کے پاس پہاڑوں پر چڑھنے کا ضروری سامان نہیں تھا۔ اس کا نیپالی سکہ چونکہ آکسیجن بیگ خیمہ، کھانے پینے کی ٹین کے ڈبوں میں بند دیرپا چیزیں، گرم کپڑے، خیمہ اور برف کاٹنے والی کلہاڑی نہیں خرید سکتا تھا۔ اس لئے ایورسٹ پر پہلا قدم جمانے کے جمانے کے باوجود ایورسٹ کی فتح انگریز کی فتح کہی جا رہی ہے۔ اگر نیپالی سکہ بھی برطانوی پاؤنڈ، شلنگ، پینس کی طرح آکسیجن بیگ کھانے پینے کی چیزیں اور پہاڑوں کے موسم کی موزوں دوائیاں خرید سکتا تو آج ایورسٹ کی فتح سات سمندر پار رہنے والے دریائے ٹیمز کے ملاحوں کے بجائے ہمالہ کے اپنے بیٹے کی فتح قرار دی جاتی۔ چنانچہ گیارہویں بار "پراسرار برفانی آدمی" سے لڑنے کے لئے روانہ ہونے سے قبل ایک ہندوستانی خبر رساں ایجنسی پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے ہمالہ کے جیالے بیٹے تین سنگھ نے افسردہ لہجے میں کہا تھا۔

"ہم ہندوستانی باشندے بہترین کوہ پیما ہیں لیکن ہمارے پاس وہ ضروری سامان نہیں ہے جو ایک کوہ پیما کیلئے ضروری ہے وہ سامان بہت مہنگا ہوتا ہے۔"

تین سنگھ کے یہ جملے اگر ایک مفلس طاقت کی مجبوری کی داستان کا بیش لفظ ہیں تو دوسری طرف واضح طور پر اس حقیقت کو بھی منکشف کرتے ہیں کہ ایورسٹ کو برطانوی کوہ پیماؤں کی قوت نے فتح نہیں کیا ہے بلکہ برطانوی سکہ نے نیپالی اور نیوزی لینڈ کے غریب آدمیوں کی قوتِ کوہ پیمائی

خریدی اور اس طرح ایورسٹ کو برطانوی پاؤنڈ شلنگ پنس اور غریب آدمیوں کی قوت نے مل جل کر فتح کیا۔ اگر تین سنگھ کی جیب بھی کرنل ہنٹ (ایورسٹ فتح کرنے والی پارٹی کے لیڈر) کی طرح وزنی ہوتی اور اگر اس کو بھی کوہ پیمائی کے سارے ذرائع حاصل ہوتے تو شاید وہ بھی اپنا قومی پرچم لے کر ہمالہ کی برفانی سیڑھیوں پر چڑھتا اور وہ حسرت آمیز باتیں نہ کہتا جو اس نے پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے نمائندے سے کہی تھیں۔ ہمالہ کی برفانی سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھنے سے پہلے تین سنگھ نے پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے نمائندے سے کہا تھا۔

"مجھے بڑا افسوس ہے کہ ہم اس مہم پر ہندوستانی پرچم کا کوئی رنگ ساتھ نہیں لے جا رہے ہیں۔ اگر اس مرتبہ ایورسٹ پر چڑھنے میں کامیابی حاصل ہو گئی تو وہ کامیابی ایک بے رنگ کامیابی ہو گی"

شیر دل تین سنگھ یہ کہہ کر ہمالہ کی برفانی سیڑھیوں پر چڑھ گیا اور اب وہ دنیا کی سب سے اونچی سفید چھت پر بیٹھا برانڈی پی رہا ہے اور اس کے سر کے اوپر برطانیہ، اتحادی قوموں اور نیپال کے رنگے برنگے جھنڈے لہرا رہے ہیں اور دنیا کا سر جیسے کوئی رنگ برنگی پگڑی باندھے ہوئے ہے لیکن کیا اب بھی اور اس کے باوجود تین سنگھ یہی سوچ رہا ہو گا کہ اس کی کامیابی ایک بے رنگ کامیابی ہے؟ کیا ہمالہ کے کندھوں پر سوار ہو جانے کے بعد "ہمالہ کا اپنا بیٹا" اداس ہے؟

ابھی تین سنگھ ہمالہ کے کندھوں پر سے نیچے نہیں اترا ہے۔ ابھی تو صرف ایک مختصر ریڈیائی پیغام کھٹمنڈو کی ترائی میں اترا ہے۔

"ہلاری اور تین سنگھ ۲۹ مئی کو ایورسٹ پر چڑھ گئے اور باقی خیریت ہے۔"

صرف اتنی سی دو سطری خبر دنیا کی سب سے بڑی خبر بن کر ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ اور نیچے کھٹمنڈو اور دارجلنگ کی آبادیوں میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں کہ

وہ ایورسٹ جس کو دیکھنے کے لیے انسان اپنا سر اونچا کرتے بھی تو نہ دیکھ سکتے تھے۔ آج اسی ایورسٹ کا غرور زمین پر پڑا ہوا ہے اور لوگ باگ سر جھکا کر حیرت سے اُسے دیکھتے ہیں۔ ادھر دارجلنگ کے ایک چھوٹے سے گھر میں ایک خوبصورت عورت کافی کی پیالی منہ سے لگائے مسرت بھرے دل کی دھڑکنوں کے شور میں یہ سوچ رہی ہے کہ جب اس کا پیار تین سنگھ اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے گا تو وہ کس طرح اس کا استقبال کرے گی؟

نیچے زمین پر تین سنگھ کے استقبال کی بڑے زور شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ پچھلے دس مرتبہ کی طرح تین سنگھ اس بار ہمالیہ کی بلندیوں سے اپنے ساتھیوں کی لاشیں نہیں لا رہا ہے اس بار وہ انسانی قوت کی شکست، تھکے ہوئے جسموں، تپتے ہوئے پنڈوں، پسینہ اور آنسوؤں کی کہانیاں نہیں لا رہا ہے۔ اب وہ جب ہمالہ کی آخری برفانی سیڑھی سے اُترے گا تو اس کے کندھوں پر اس پُراسرار برفانی آدمی کی لاش ہوگی جو دنیا کے پہلے دن سے ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء تک ہمالہ کی خوبصورت اور مغرور بیٹی کو اپنی سخت اور بے رحم بانہوں میں جکڑے ہوئے تھا۔ اب اس کے پاس انسانی قوت کی عظیم ترین فتح کی داستان ہوگی۔ اب وہ پسینہ اور آنسوؤں کے بجائے پسینے اور مسکراہٹوں کی کہانیاں سنائے گا۔ وہ دُنیا کی اس سب سے اونچی ننگ کی حیرت انگیز باتیں بتائے گا۔ جہاں وہ اپنے نقوشِ قدم، سینڈوچز کے خالی ڈبے اور برانڈی کی خالی بوتلیں چھوڑ آیا ہے اور جہاں اس نے یونین جیک، اتحادی قوموں اور نیپال کے پرچم لہرا کر ہمالہ کی صدیوں پرانی "سفید بلندی" کو رنگین بنا کر دیا ہے۔ اور اس کے باوجود اس کی کامیابی بے رنگ ہے۔

..... لیکن جب تین سنگھ نیچے زمین پر اُتر جائے گا تو اس کو یہ معلوم کر کے دُکھ ہوگا کہ اس کے اپنے ہمالہ کی بیٹی جس کو اس نے گیارہ بار جان جوکھوں میں ڈال کر اُتار کر لایا ہے

سات سمندر پار ایک شاہی حرم کی لونڈی بنا دی گئی ہے۔ اور اب وہ ہمالہ کی بیٹی نہیں ہے بلکہ ماؤنٹ الزبتھ کے نام سے پکاری جا رہی ہے۔

نیچے زمین پر اتر آنے کے بعد تین سنگھ کا بڑا پرجوش استقبال کیا جائے گا۔ اس کا مشہور نام ساری دنیا میں دیس دیس پھیرتا رہے گا۔ صدیوں تک زندہ رہنے والے نام کی سانسیں اس کی اپنی عمر طبعی میں بہت سے برسوں کا اضافہ کر دیں گی۔ اس کو تاحیات پنشن ملتی رہے گی، لیکن یقین ہے کہ تین سنگھ جس کی زندگی کا واحد اسپورٹ کوہ پیمائی ہے، وہ صرف ایک ایورسٹ سر کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے نہیں تھک جائے گا۔ اس کو اور اس طرح ہزاروں تین سنگھوں کو ابھی اور بہت سے ایورسٹ فتح کرنے ہیں۔

ہمالائی ایورسٹ کے علاوہ بھی اس زمین پر بہت سے ایورسٹ ہیں جو بظاہر تو نظر نہیں آتے لیکن ان ایورسٹوں نے انسانی زندگی میں اس قدر تکلیف دہ بلندیاں اور پستیاں پیدا کی ہیں کہ جن کی وجہ سے دنیا سینکڑوں جہنموں میں بٹی ہوئی ہے۔

ان نظر نہ آنے والے ایورسٹوں میں سب سے اونچا ایورسٹ دولت اور امیری کا ایورسٹ ہے جہاں معدودے چند انسان دنیا کے سارے انسانوں کی نعمتیں چرا کر چھپے بیٹھے ہیں اور اس ایورسٹ کی ترائی میں لکھوکھا انسان، بھوک، بے کاری، بیماری اور موت کے جہنموں میں رینگ رہے ہیں۔

دوسرا ایورسٹ حکومت اور آقایت کا ایورسٹ ہے جہاں بیٹھ کر حاکم اور آقا کروڑوں زنجیر بکف غلاموں کی جھکی ہوئی ننگی پیٹھوں پر ظلم و استبداد کے کوڑے برسا رہے ہیں۔

تیسرا ایورسٹ سفید رنگ اور اعلیٰ نسل کا ایورسٹ ہے جو دنیا کے کروڑوں، لاکھوں سیاہ رنگ انسانوں کو نفرت، محرومی اور موت کی پستیوں سے ابھرنے نہیں دیتا۔ جب تک انسانی زندگی کے ان ایورسٹوں کی تسخیر نہیں کی جاتی جب تک انہیں فتح نہیں کیا جاتا۔

جب تک انہیں ہموار نہیں کیا جاتا اور جب تک ان کا غرور نہیں توڑا جاتا اس وقت تک یہ دعویٰ کرنا کہ ایورسٹ فتح ہوگیا، محض ایک انسانی ڈینگ ہے۔

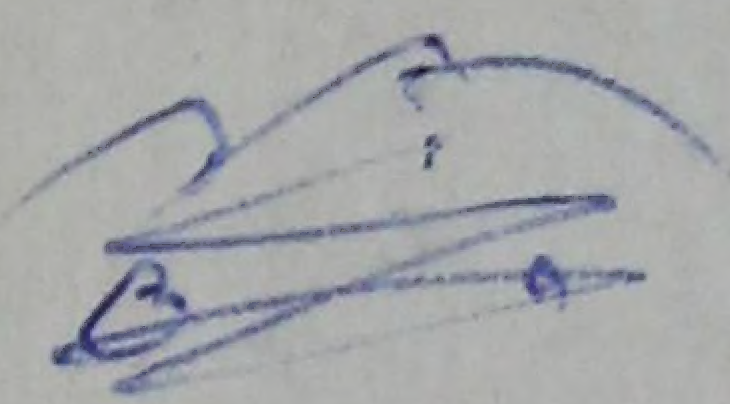
ہمالائی ایورسٹ کی تسخیر انسان کے "بلندیوں کے سفر" کی پہلی منزل۔ اور یہ منزل انسان کے لئے کئی اور ایورسٹوں کی تسخیر کے لئے ایک نئی شاہراہ کھولتی ہے۔ اس منزل پر دارجلنگ کا ہندوستانی نژاد نیپالی قلی تین سنگھ اور نیوزی لینڈ کا شہد فروش ہلاری تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں سے دوسرے تین سنگھ اور دوسرے ہلاری نئے ایورسٹوں کو فتح کرنے نکل پڑتے ہیں۔ اور پھر ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء کی طرح دنیا پر وہ چمکیلی رات بھی چھا جائے گی جب انسانیت کی سوتی ہوئی ملکہ کو جگا کر دنیا کی آخری خوشخبری سنائی جائے گی کہ

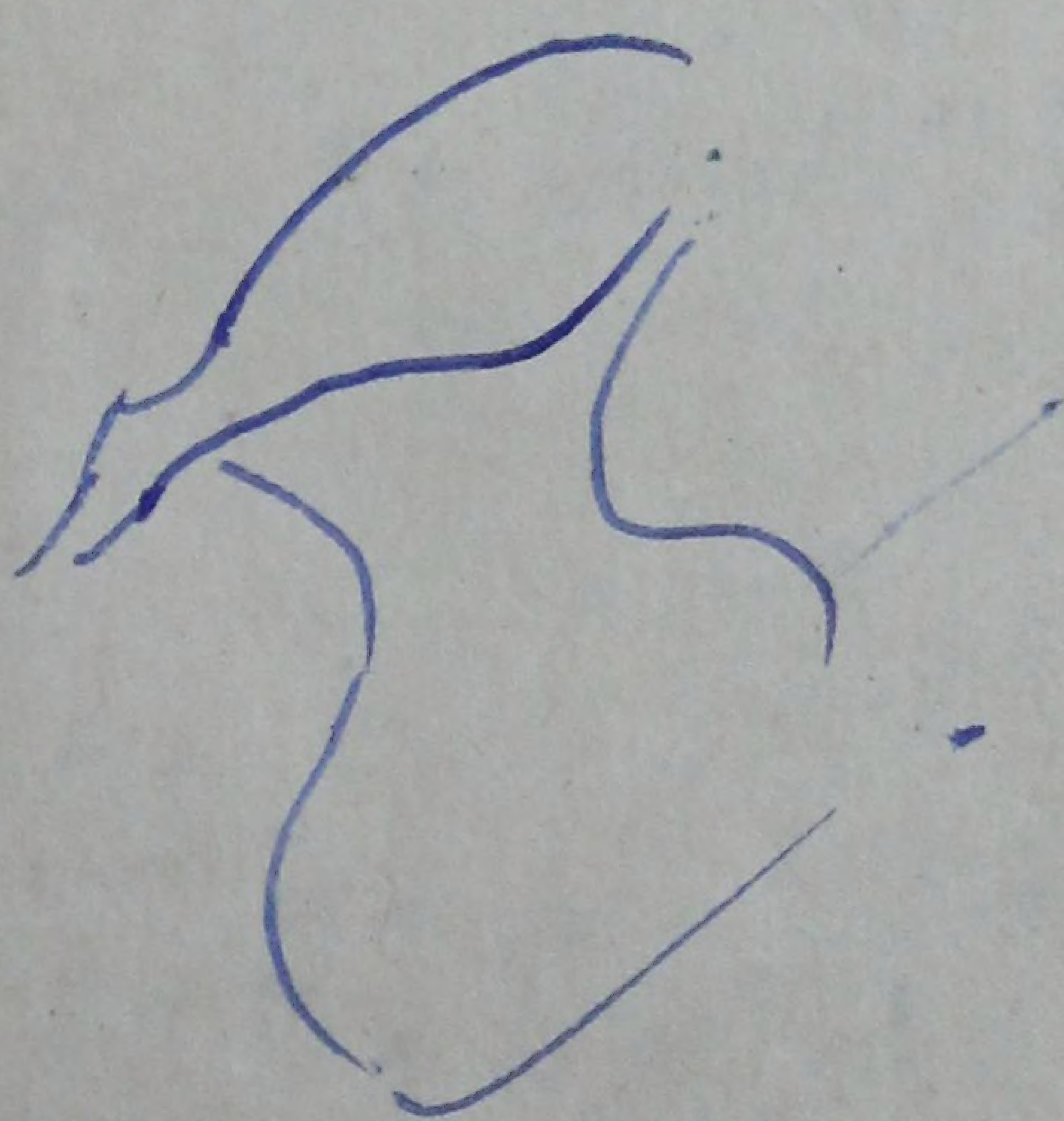
"دنیا کے سارے ایورسٹ فتح ہو گئے ہیں اور سارے انسان زندگی کی انتہائی بلندی پر جمع ہو کر دوامی مسرت کی شرابیں پی رہے ہیں"

Farooq Khan
2nd Nov. 1953
Gilkar
MR. M. F. B.Sc. LL.B.

2231







572 M. Ashraf.

Eng. 50 52

Physics 45

Che[illegible]

Bio[illegible]

English

Math

[illegible]

[illegible]

[illegible] 5

[illegible] 50

300

[illegible]